قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک سالانہ پاکستان / ۴۸ روپے غیر ممالک / ۱۱۰ روپے	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۴ چار روپے
جلد ۳۹	نومبر ۱۹۸۶ء	شمارہ ۱۱

فہرست

۱۔ نذرانۂ عقیدت بحضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) (از محترم پرویز علیہ الرحمۃ) ۳

۲۔ لمعات ——— ۱۱

۳۔ حضورِ رسالتمآب کی کہانی : خدائے برتر کی زبانی۔ (تقریر محترم پرویز صاحبؒ) ۱۷

۴۔ حقائق و عبر: (۱) تحریکِ پاکستان میں شامل ہونے سے ذہن پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ ۳۶
(۲) نظریۂ پاکستان کے نئے اجارہ دار! (۳) ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا اپنے فتوے پر اصرار
(۴) بہشتیوں کا استقبال! (۵) مجوزہ شریعت بل کے بارے جمعیت اہلحدیث کا مؤقف (۶) مجوزہ شریعت بل
کی تائید برداشت نہیں (۷) جماعتِ اسلامی اور واحد اسلامی مملکت۔

۵۔ حکیم الامت علامہ اقبال، قائداعظم، علماء اور مودودی صاحب (محترم پرویز صاحبؒ) ۴۱

۶۔ حقوق یا فرائض (ثریا عندلیب صاحبہ) ——— ۶۲

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت : ۲۵ بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور۔ مطبوعہ : اشرف پرنٹنگ پریس ۹ ایبک روڈ لاہور

هر کجا بینی جهانِ رنگ و بو
آنکه از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اورا بهاست
یا هنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ

نذرانۂ عقیدت
بحضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم)

یوں تو طلوعِ اسلام کی ہر اشاعت، قرآن اور صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کے تذکارِ جلیلہ کی آئینہ بردار ہوتی ہے، لیکن ربیع الاوّل کا مہینہ نوعِ انسان کے لیے جس خیر و برکت کا ضامن اور یمن و سعادت کا مہبط ہوتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر اس ماہ سے متعلق اشاعت میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے سلسلہ میں خصوصی نذرانۂ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں کسی تجسس و کاوش کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ پروینؔ صاحب کی مایۂ ناز اور منفرد تصنیف، معراجِ انسانیت میں گہرہائے عقیدت انبار در انبار اور گل ہائے مدحت روش در روش موجود ہیں۔ ہم اسی کفِ گل فروش و داماں باغباں کی خوشہ چینی سے چند برگہائے خوش رنگ پیش کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔

(۱)

وہ آئے بزم میں:

شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدّن کے پھول وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر ختم ہو چکے تھے۔ زمین پر جو ہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں، خاسر و نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا، لیکن خدا کی اس وسیع سرزمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و ناامید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھی کہ متیٰ نصرُ اللہ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اٹل قانون نے اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا۔

اس رب ذوالمنن کا سحابِ کرم، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزاروں جنتیں اپنے آغوش میں لئے ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلدِ امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا۔ انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدّن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آگئی۔

عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہوگئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے، حیاتِ تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جان کش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کے نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اس ذاتِ اقدس و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہوگئی جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہوگئی جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے۔ جہاں عقل و عشق، ناسوت و لاہوت یہ اور وہ قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں جو دانشِ روحانی اور حکمتِ برہانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ نوامیسِ فطرت نے "جنّت سے نکالے ہوئے ابنِ آدمؑ" کے اس طالعِ بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا کے طاغوتی قوتوں کے تخت الٹ گئے کہ وہ آنے والا آگیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتش کدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب انسانی تصوّرات کی دنیا، نار کی جگہ نور سے معمور ہوگئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلکِ ابراہیمیؑ کی تکمیل کا دن آگیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آگیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہوگئیں کہ آج اس آفتابِ عالم تاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے جگمگاتا چراغ کہہ کر پکارا۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (۳۳/۴۵-۴۶) وہ آنے والا کہ جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ (۷/۱۵۷) جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جس میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی۔ احبار و رہبان کی برہمنیت کے طوق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں تقسیم انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی عطا ہوا۔ اور انسان ایک بار پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہوگیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

محبّت از نگاہش پائدار است | سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن | جہانِ شوق را پروردگار است

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً ... [illegible]

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ (۳۰/۵۰)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا!

جب مشیّتِ ایزدی کی تدبیرِ محکم جس کے لئے زمین و آسمان یوں قرنہا قرن سے سرگرداں پھر رہے تھے، اپنے نقطۂ تکمیل

تک پہنچی۔ جب انسانیت، جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے حریم شباب میں آگئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آگیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی سرمئی روشنی میں کوثر و تسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے راز ہائے دروں پردہ کے معدن لال و گہر کو اپنے اندر سموئے تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کے پھولوں سے وادیٔ بطحا کی سرزمین آرائش کر دیں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آگئی۔ ہر طرف سے مسرتوں کے چشمے اُبلنے لگے۔ چاند مسکرایا، ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر، ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصوّر بن کر چمکنے لگی۔ فلک، تعظیم کے لئے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اٹھے۔ بلد امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی۔ جس کی طرف جبلِ امین پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جس کوہ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجۂ تسکینِ خاطر بتایا تھا۔ جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئیں تھیں اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیل اکبرؑ اور ذبیح اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا، کہ جس کے انتظار میں زمانے نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں آیا، اور اس شانِ زیبائی، رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدودِ فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اُٹھے۔ فضائے عالم درود و صلاۃ کی فردوسِ گوش صداؤں سے گونج اٹھی اور انس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اُٹھے کہ ؎

اے شہسوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہاں تو کر د فکرِ انس و جاں — تو صلوٰۃِ صبح تو بانگِ اذاں

(۰)

مقامِ محمدیؐ

یہ آنے والا رسول کافۃً للناس اور رحمۃ اللعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اس کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو حضورؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی۔ جو قلبِ محمدیؐ میں اتاری گئی۔ مشامِ جان نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی انہی پتیوں کہ رہینِ منت تھی۔ جن کا گلدستہ اس نبی آخرالزماںؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں سجایا گیا۔

پیغامِ محمدیؐ کیا ہے۔ انہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی آندھی کے تیز جھونکوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور انہی درخشندہ و تابندہ ذرّات نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی کہ جن کے حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی فرطِ عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ

الگ پڑے تھے یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں یہ ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے۔ یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے یہ ملّت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است　　　رحمۃ اللعالمینی انتہا است

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جاتے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر صاحبِ بصیرت پکار اٹھتا ہے کہ ؎

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد　　بہ نگاہ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

قلبِ وادیٔ فاران، یعنی ام القریٰ مکہ، اپنی تمام نگاہ فریب جاذبیتوں کے ساتھ ہر عاکف و بادی کے لئے مرکزِ قلب و نظر بنا ہوا ہے۔ چونکہ ریگ زارِ حجاز کے ہر ذرہ کی عقیدت حریمِ کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لئے مختلف دیارِ نزد و دور کارواں در کارواں اپنی پیشانیوں میں تڑپتے ہوئے سجدوں کے نذرانے لئے، رواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجعِ انام کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ جبینِ شوق سجدوں سے معمور ہے۔ لیکن کچھ معلوم نہیں کہ مسجود کیا ہے؟ قلبِ نیاز جذبہ ہائے تعبّد سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ و تاز ہر نوع ہنگامہ خیز ہے۔ لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ اس تگ و تاز سے مقصود کیا ہے۔ کاروانِ حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کونسی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت برپا ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کیئے ہوئے ہے۔ اس کیف و مستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے۔ کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی کعبہ کے گرد گھوم گھوم کر سفر ختم ہونے کے باوجود ذوقِ سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے آستانے پر جانور ذبح کر کے ان کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا جام و سبو کے امتیازات مٹا رہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو صبر گریز پا اور رنج گراں نشیں کے جگر سوز افسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیاں اپنی سحر آفرینیوں سے ہر سننے والے دل اپنی مٹھی میں لئے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرے سے اس کے طرہ استکبار میں اور بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کر کے اس کی رگوں میں آتشِ انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزمِ شعر خوانی آن کی آن میں

ہنگامہ بن جاتی ہے لیکن محفلِ عیش و طرب ہے یا میدانِ جنگ و جدل ہر شخص پورے جذب و انہماک سے اس میں حصہ لیتا ہے اور اس ہمہمہ اور طنطنہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر، یوں مستغرق ہوتا ہے کہ کوئی کشش اسے اس ہنگامے سے باہر نہیں لے جا سکتی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب، مرد، عورت، سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہیں گویا یہ کچھ ان کی معاشرت کا جزو اور ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکا ہے

لیکن مکہ کی ان پُر ہجوم گلیوں میں ایک شخص ایسا بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی طرزِ معاشرت، وضع قطع، تراش خراش سب انہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے۔ انہی لوگوں کے سے کاروبار کرتا ہے۔ ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں جن کی پرورش بطریق حسن کرتا ہے وہ اپنے آپ کو انہی جیسا انسان سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کچھ خلا سا محسوس کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ خلا کیا ہے اور کس طرح پُر ہو سکتا ہے۔ وہ مشاغل و مشارب، جو اس کی قوم کا جزو زندگی بن چکے ہیں، اس کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ بھی اپنی جبینِ نیاز میں ذوقِ عبودیت کے سجودِ رقصاں لے کر حریم کعبہ تک جاتا ہے لیکن وہ ان گہر ہائے تابندہ کو اسی طرح واپس لے آتا ہے کہ وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی چوکھٹیں اس متاعِ گراں مایہ کے شایانِ شان دکھائی نہیں دیتیں۔ جب وہ انسانوں کی گردنوں کو ان کی خود تراشیدہ مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتا ہے، تو محو حیرت رہ جاتا ہے کہ ــــ یا الٰہی یہ کیا ماجرہ ہے؟ وہ عکاظ کے بازار میں جب سردارانِ قریش کو اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے دیکھتا ہے تو ہر چند وہ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کا فرد ہے، لیکن اس کا دل گواہی نہیں دیتا کہ جس چیز میں انسان کے اپنے کردار کو کوئی دخل نہ ہو وہ باعث فخر و تکبر ہو سکتی ہے۔ وہ بزمِ مے پرستی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کہ اس سے اس کا قلبِ سلیم ابا کرتا ہے۔ وہ قمار خانوں کی طرف قدم نہیں اٹھاتا کہ وہاں اسے مہذب انسانوں کے بھیس میں رہزن دکھائی دیتے ہیں ــــ وہ جب ان محافل و مجالس میں اپنے لئے کوئی تسکین نہیں پاتا تو عیسائی رہبان اور یہودی احبار کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اس نے سن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لئے وہ ان علماء مشائخ سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس کون سی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن ان سے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی ساخت کے ایسے فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصلی روشنی کو ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بھی ٹھنڈی آہ بن کر اُٹھ آتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ انہی بستیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی طرح ان معبودانِ باطل سے متنفر ہیں۔ وہ ان کی طرف رجوع کرتا ہے کہ شاید وہیں وہ سکون مل جائے جس کی اسے تلاش ہے۔ لیکن اسے ان کا ذوق تشنہ اور تڑپ خام نظر آتی ہے وہ وہاں سے بھی مایوس واپس آتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے اسے کوئی ایسا دوسرا انسان نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش و خلش اور سوز و گداز کا ماجرہ کہہ سکے۔ وہ اس تنہائی سے اُکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر پکار اٹھتا ہے کہ ؎

درین میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر — کہ من شاید نخستین آدمم از عالمے دیگر

وہ انسانوں کی بستیوں میں اپنے دل کی پکار کا کوئی جواب نہیں پاتا تو باہر فطرت کی کھلی فضاؤں میں

چلا جاتا ہے۔ وہاں کبھی صحراؤں کی ناپیدا کنار وسعتوں پر غور کرتا ہے اور کبھی آسمانوں کی حدود فراموش پہنائیوں پر۔ گاہ اسے ستاروں کی تابندگی دعوتِ غور و فکر دیتی ہے اور گاہ ماہِ عالم تاب کی درخشندگی سامانِ تدبر و تفحص پیدا کرتی ہے وہ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں پر غور کرتا اور بار بار اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلہ کائنات کس طرح وجود میں آگیا؛ کون اسے بایں حسن و خوبی چلا رہا ہے؟ اس کا بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ سوالات رہ رہ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اسے ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جب جواب نہیں ملتا تو اس سے اس کے دل کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے۔ اور جب اضطراب بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تشنگیٔ ذوق کی شدت تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے اپنے آپ پر ضبط اس قدر ہے کہ وہ اس کاوشِ اضطراب کو اپنے معمولاتِ زندگی پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے کاروباری معاملات، بال بچوں کی نگہ پرداخت رفقاء و احباب سے میل ملاقات۔ معاشرتی زندگی کے مقتضیات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا۔ اور ایسی زندگی بسر کیے جاتا ہے کہ اس کے ابنائے جنس اپنے ہیں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ بجز اس کے کہ وہ اس کے کیریکٹر کی بلندی کے مداح ہیں اور اس کی صداقت و دیانت کے معترف۔ چھوٹا بڑا سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ قوم اور خاندان کو اس کی شرافت و اصالت پر ناز ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ان سے کچھ مختلف محسوس کرتا ہے۔ اس لئے کہ جن گوشوں کو انہوں نے اپنے لئے وجہِ اطمینان اور موجبِ تسکین قرار دے رکھا ہے وہ ان میں سے کسی میں بھی اپنے اضطراب کا مداوا نہیں پاتا۔ وہ اپنے آپ کو ہر آن کسی ایسی چیز کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پاتا ہے جس کا اسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے؟ کارلائل کے الفاظ میں:۔

"شروع ہی سے چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے:۔

میں کیا ہوں؟ کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ مجھے کس چیز پر ایمان رکھنا چاہیئے؟

حرا اور فاران کی پہاڑیاں، ریت کے ٹیلوں کا سکوت، ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ ان سوالات کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی وحی سے ملنا تھا۔ جو اس روح کو اپنا مسکن بنالے۔

HEROES AND HERO ——— WORSHIP P. 49

ہاں ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں مل سکتا تھا۔ ان کا جواب صرف وحی کی زبان سے مل سکتا تھا۔ اور نبیؐ قبل از نبوت وحی سے واقف نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت قبل از نبوت حضورؐ کی تھی۔

نبوت خالصۃً خدا کی موہبت ہوتی تھی جس میں ہونے والے نبی کے اپنے ملکہ یا کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ خدا جس ذات کو اس منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کر لیتا تھا، اسے اپنے پروگرام کے مطابق، ایک وقتِ معینہ پر نبوت عطا کر دیتا تھا یہی وجہ تھی کہ نبیؐ کو قبل از نبوت، وحی کا علم نہیں ہوتا تھا۔ (حضورؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔)

مقامِ نبوّت

نبوّت کا مقام اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تصوّر سے روح میں بالیدگی، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا قلب میں روشنی، خون میں حرارت، بازوؤں میں قوّت، ماحول میں درخشندگی، فضا میں تابندگی اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ نبیؐ کا پیغام انقلاب آفریں۔ دین و دنیا کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا امین ہوتا ہے۔ وہ مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دیتا ہے۔ اس سے قوم کے عروقِ مفلوج میں پھر سے خونِ حیات رقص کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی ملّت کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اور ان کے ایک ہاتھ میں زمین کی خلافت اور دوسرے میں آسمان کی بادشاہت دے دیتا ہے۔ وہ اپنی ہوش ربا تعلیم اور محیر العقول عمل سے باطل کے تمام نظام ہائے کہنہ کی بنیادیں اکھیڑ کر آئینِ کائنات کو ضابطۂ خداوندی پر متشکل کر دیتا ہے۔ اس سے زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے اور آرزوئیں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتی ہیں۔ ولولے جاگ پڑتے ہیں۔ ایمان کی حرارتیں دلوں میں سوز اور جگر میں گداز پیدا کرتی ہیں۔ رُوح میں مسرّتوں کے چشمے ابلتے ہیں۔ قلب وجگر کی نورانیت کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ تازہ امیدوں کی کلیاں مہکتی ہیں۔ زندہ مقاصد کے غنچے چٹکتے ہیں اور اس خوش بخت قوم کا صحنِ چمن، دامانِ صد باغبان و کفِ گلفروش کا فردوس اپنا منظر پیش کرتا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام اس کا نصب العین اور قوانینِ خداوندی کا نفاذ اس کا منتہا ہوتا ہے۔ جب اس کے ہاتھوں خدا کی بادشاہت کا تختِ ہمایوں بچھتا ہے تو باطل کی ہر طاغوتی قوت پہاڑوں کے غاروں میں سر چھپاتی پھرتی ہے۔ جور و استبداد کے قصرِ فلک بوس کے کنگرے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ طغیان و سرکشی کے آتش کدے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے رفقا کی قدوسی جماعت کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے باہر نکلتا ہے تو فتح و ظفر اس کی رکاب چومتی ہے۔ شوکت و حشمت اس کے جلو میں چلتی ہے۔ سرکش اور خود پرست قوتیں اس کے خدائے واحد القہار کا کلمہ پڑھتی ہیں اور خدا اور اس کے فرشتے، ان انقلاب آفریں ملکوتی کارناموں پر تحسین و تبریک کے پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ۔

(•)

قرآن و سیرت

آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت سے مقصود و مطلوب کیا ہے اس کی تشریح و تبیین میں کتابوں پہ کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن اگر اسے مجملاً چند الفاظ میں سمجھنا ہو تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی تمدّنی اور معاشی زندگی یعنی ہیئت اجتماعیہ کو کس طرح ان مستقل اقدار سے ہم آہنگ رکھ سکتا ہے جو ایک ہمہ گیر آفاقی ضابطہ قوانین کی حیثیت سے کارگہ ہستی کو اس نظم و ضبط، توازن و اعتدال اور حسن و رعنائی سے نہ صرف سرگرم عمل رکھ رہی ہیں۔ بلکہ اس کے تعمیری پہلوؤں کو بروئے کار لا کر اسے تخلیقی ارتقاء کے مراحل طے کراتے ہوئے رواں دواں جانبِ منزل لئے جا رہی ہیں۔ قرآن میں اقوام و مِلل سابقہ کے احوال و کوائف اور حضرات انبیاء کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ سے بھی یہی بتانا مقصود ہے کہ جب انسان نے اپنے تمدنی و معاشی نظام (یعنی حیاتِ اجتماعیہ) کو آفاقی قوانین سے الگ کر لیا تو اس کا نتیجہ زندگی کی ان ناہمواریوں کی شکل میں سامنے آ گیا جسے وہ فساد کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ اور جس سے کمالِ انسانیت، شرفِ بشریت کی بلندیوں کی طرف جانے کی بجائے سبعیت و بہیمت کی پستیوں کے جہنم میں

جاگرا۔ اور اس کے برعکس، جب انہوں نے اپنی زمینی زندگی (حیاتِ دنیا) اور آسمانی اقدار میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کرلی تو کس طرح زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی اور عالم انفس و آفاق میں کس طرح شگفتگی و شادابی کی جنتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ بعثتِ نبی اکرمؐ کے وقت یہ فساد اپنی وسعتوں اور گہرائیوں کے اعتبار سے پوری شدت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن نوعِ انسانی کے محسنِ اعظمؐ اور آسمانی انقلاب کے اس داعیٔ اکبرؐ کے تیئیس[۲۳] سالہ سعی و عمل سے انسانی نظامِ حیات کے یہ تمام ناہموار گوشے یکسر ہمواریوں اور استواریوں میں بدل گئے۔ اور انسانیت نے اس فردوسِ گم گشتہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے تبسّم ریز و گوہر فشاں دیکھ لیا جس کی تلاش میں وہ قرن ہا قرن سے حیران و سرگرداں پھر رہی تھی۔ لہٰذا سیرتِ محمدیہ درحقیقت تعارف و تاریخ ہے اس انقلاب کی جس سے انسانیت پستیوں اور ناہمواریوں کے اس ذلّت آمیز و کرب انگیز جہنّم سے نکل کر جس میں اسے ملوکیت کی مستبدانہ دراز دستیوں، پیشوائیت کی ابلیسانہ دسیسہ کاریوں اور مفاد پرست گروہوں کی سفاکانہ کی خون آشامیوں نے دھکیل رکھا تھا۔ بلندیوں اور ہمواریوں کی اس روح پرور اور نشاط انگیز جنت میں جا پہنچی جس میں ہر متنفس کے مضمر جوہروں کی بالیدگی اور ثمرباری کے اسباب و مواقع بلا روک ٹوک موجود تھے کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ اس شجرِ طیّب کی طرح جس کی جڑیں زمین میں محکم و استوار ہوں اور جس کی شاخیں آسمانی جنت در آغوش فضاؤں میں مسرّتوں کے جھولے جھول رہی ہوں۔ ذَالِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ط

بقیہ: حقوق یا فرائض (صفحہ ۶۴ سے آگے)

گویا کچھ نہیں دیکھا۔ برعکس اس کے ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک قرآنی معاشرہ میں اس مفاد پرستی و خود غرضی کی گنجائش نہیں۔ قرآن حکیم ایسی ذہنیت پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں ہر فرد دوسرے افرادِ معاشرہ کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کے لئے اپنی کوششوں کے ماحصل کو کھلا رکھے۔ اور یہ جان لے کہ افرادِ معاشرہ اعضائے انسانی کی طرح ہوتے ہیں۔ اور ایک عضو اس وقت تک پوری پوری نشوونما حاصل ہی نہیں کر سکتا جب تک دیگر اعضا بھی پوری پوری نشوونما نہ پا رہے ہوں۔ قرآنی اصول و اقدار کی روشنی میں حقوق و فرائض کی ادائیگی کا "تدریجی سفر" بالآخر اس منزلِ مقصود تک لے جاتا ہے۔ جہاں ہر شخص دوسرے شخص کا حق بطیبِ خاطر ادا کرتا ہے اور یوں معاشرہ تمام افرادِ معاشرہ کی ذمہ داریاں اُٹھا لیتا ہے۔ پھر کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں رہتا۔ لیکن اگر ہم نے حقوق کے نعرے لگاتے ہوئے فرائض کو بھلائے رکھا تو انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کی حق تلفی کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ نہ ہی مغفرت ملے گی۔ وہ معاشرہ کبھی ترقی و سرفرازی حاصل نہیں کر سکتا جہاں حقوق و فرائض کی تقسیم اس طرح ہو کہ فرائض اور ذمہ داریاں تو ایک طبقہ پہ لاد دی جائیں اور حقوق سارے کے سارے دوسرا طبقہ اپنی جھولی میں بھر لے۔ معاشرہ وہی پھل پھول سکتا ہے۔ جہاں حقوق و فرائض شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ جہاں یہ جھگڑا نہیں ہوتا کہ یہ حقوق میرے ہیں اور یہ فرائض تیرے۔ یہ معاشرہ قرآنی معاشرہ ہوتا ہے۔ جہاں ہر شخص اپنے فرائض ادا کرتا ہے اور ہر شخص کو اس کے حقوق ملتے ہیں۔ کیا ہم پہ یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟

سوچیے!

ثریا عندلیب

لمعات

علامہ غلام احمد پرویز صاحب نے آج سے اکتیس سال پہلے، ملکِ عزیز کے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک قابلِ قدر کتاب نظامِ ربوبیت تصنیف فرمائی تھی۔ اس عظیم کتاب کا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا:

انسان کی حیاتِ ارضی کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ سامانِ نشوونما جو فطرت کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ عطا ہوا ہے، اس کی تقسیم کس طرح کی جائے کہ وہ تمام افرادِ انسانیہ کی نشوونما کا ذریعہ بن سکے۔ ایسی نشوونما کا ذریعہ کہ ان کی طبیعی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور ان کی مضمر صلاحیتیں بھی ابھرتی چلی آئیں۔ یہ ہے وہ بنیادی مسئلہ جس کا صحیح حل نہ ملنے کی وجہ سے انسان اس قدر جگر سوز مشقتوں میں مبتلا چلا آتا ہے۔ قرآن کریم نے اس مسئلہ کو تین لفظوں میں بیان کر دیا ہے، اس نے جب آدم (یعنی آدمی) سے کہا کہ تم نے زمین پر رہنا ہے تو ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (البقرہ - ۳۶) تمہارے مفاد میں ٹکراؤ ہوگا، تم میں سے ہر ایک چاہے گا کہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹ لے، خواہ دوسروں کے لئے کچھ نہ بچے، نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ کچھ لوگ اتنا کچھ سمیٹ لیں گے کہ اس کے رکھنے کے لئے جگہ نہ ہوگی اور دوسرے لوگ، زندگی کی بنیادی ضرورتوں تک محتاج ہو جائیں گے۔ جو لوگ اس طرح رزق کے سرچشموں پر قابض ہو جائیں گے، وہ دوسروں سے اپنی مرضی منوائیں گے اور ان پر اپنا حکم چلائیں گے، اس سے انسانی معاشرے میں فساد برپا ہوگا اور خونریزیاں ہوں گی۔ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ

(نظامِ ربوبیت صفحہ ۲۰ ایڈیشن ۱۹۷۸)

لیکن افسوس کی بات ہے کہ علامہ صاحب کی بات پر کسی نے کان نہ دھرا اور ملکِ عزیز کی آج بھی وہی حالت ہے۔ جو آج سے تیس چالیس سال پہلے تھی۔ معاشی ناانصافیوں کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں کسی نہ کسی شکل میں فساد برپا رہا۔ ملک کے کسی حصے میں یہ فساد نازک صورت اختیار کر لیتا ہے تو ہمیں قومی المیے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پندرہ سال پہلے مشرقی پاکستان کا المیہ، ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا اور اس کی تلافی کیلئے

ہمیں اسلام کے نظامِ ربوبیت کی طرف پیشرفت کرنی چاہیئے تھی، لیکن افسوس ہے کہ ہم نے اتنے بڑے قومی المیے سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ملک کے ایک دوسرے حصّے یعنی سندھ میں ہم ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں۔

قرآن مجید نے انسانی معاشرے میں فساد پیدا کرنے والی جن وجوہات کا ذکر کیا آج انہی کی بناء پر سندھ کے صوبے میں حالات ابتر ہو رہے ہیں۔ قومی اخبارات کی ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں پارلیمنٹ کے سامنے سندھی بھائیوں کے مظاہرے کی جو تفصیلات شائع ہوئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے اس علاقے میں خیریت نہیں ہے۔ وزیراعظم پاکستان نے مظاہرین کے ایک چھ رکنی وفد سے ملاقات کی۔ اس وفد نے وزیراعظم کو بتلایا کہ وہاں امن وامان کی حالت اس حد تک خراب ہو چکی ہے کہ لوگ ڈاکوؤں کے خوف سے گھروں سے نہیں نکلتے۔ دیہات ویران ہو رہے ہیں اور دیہی آبادی شہروں کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ انہوں نے وزیراعظم سے دردمندانہ درخواست کی کہ سندھ میں امن وامان کی صورت کو بہتر بنانے کے لئے فوری اقدامات اٹھائے جائیں۔ سندھ کی موجودہ نازک صورتِ حالات کے بارے میں، ہمارے لیڈر، مختلف آراء کا اظہار کر رہے ہیں کوئی کہتا ہے کہ تعلیم یافتہ سندھیوں کی ایک کافی تعداد بیکاری کا شکار ہو کر مایوس ہو چکی ہے۔ کوئی اپنے سیاسی مخالفین پر حالات کو بگاڑنے کا الزام دھرتا ہے۔ مذہبی لیڈروں کا خیال ہے۔ کہ سندھ کے دانشور ہندو اساتذہ سے متاثر ہو کر، پاکستان کے خلاف ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مشرقی پاکستان کے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہاں بھی صورت حالات کو ہندو اساتذہ نے خراب کیا تھا۔ اور وہاں کے دانشور، ہندو اساتذہ کی بولیاں بولنے لگ گئے تھے، جس کے نتیجے میں ہمیں ایک دردناک قومی المیے کا صدمہ سہنا پڑا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ سندھ میں بھی پندرہ سال پہلے والا مشرقی پاکستان کا ڈرامہ دھرایا جا رہا ہے۔

کچھ لوگ سندھ میں غیر حاضر زمینداری نظام کا نام بھی لے رہے ہیں کہ وہاں کے حالات کی خرابی کا ذمہ دار یہی نظام ہے۔ لیکن یہ بات اتنی ہلکی آواز سے کہی جا رہی ہے کہ بہت کم لوگوں کو سنائی دے رہی ہے۔ تاہم آج مورخہ دس اکتوبر کے قومی اخبارات کے مطابق ڈکاڑہ سے قومی اسمبلی کے ممبر جناب میاں زمان نے قومی اسمبلی میں اس حقیقت کا اعلان کیا کہ سندھ میں امن وامان کی خرابی کا ذمہ دار وہاں کا جاگیردارانہ نظام ہے۔

(روزنامہ جنگ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء)

یہ وہی نظام ہے جسے علامہ پرویز صاحب قرآن مجید کی اصطلاح میں بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ سے تعبیر فرمایا کرتے تھے جس کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

ہمارے مذہبی لیڈر، جو اس فساد کی ذمہ داری غیر ملکیوں پہ ڈال کر بالواسطہ طور پر اس جاگیرداری نظام کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، تو ان کی خدمت میں عرض ہے۔ کہ مشرقی پاکستان میں بھی حالات کو بگاڑنے کا سب سے بڑا سبب یہی جاگیرداری نظام تھا اور جن لوگوں نے، بنگلہ دیش کی آزادی کا نعرہ لگایا۔ انہوں نے عوام سے یہی وعدہ کیا کہ 'آزادی' کے بعد وہ ان لوگوں کو جو اراضی پہ کام کر رہے ہیں، اس زمین کا مالک بنا دیں گے۔ چنانچہ وہ لیڈر اپنے وعدے میں، سچے تھے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد، وہاں پہ غیر حاضر زمینداری کا نظام ختم کر دیا گیا اور زمین کی زیادہ سے زیادہ حد ملکیت آٹھ ہیکٹر مقرر کی گئی جو بیس ایکڑ سے بھی کم بنتی ہے۔ یہ اتنا رقبہ ہوتا ہے کہ جسے ایک کاشتکار آسانی سے کاشت کر سکتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بنگلہ دیش میں یہ فیصلہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اٹھایا گیا ہے، جس کی تفصیلات آئندہ سطور میں پیش کی جا رہی ہیں۔

مشرقی پاکستان کے حالات سے متاثر ہو کر، یہی وعدہ، سنہ ۱۹۷۷ء میں قائم ہونے والے قومی اتحاد نے پاکستانی قوم سے کیا۔ چنانچہ قومی اتحاد نے اپنے منشور میں اس حقیقت کا اعلان کیا کہ غیر حاضر زمینداری کا نظام غیر اسلامی ہے، اور قومی اتحاد برسر اقتدار آکر اسے ختم کر کے، زمین اسی کاشتکار کے پاس رہنے دے گا۔ جو اس میں عملاً کام کرے گا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ جب حکومت بدلنے کے بعد، قومی اتحاد والے شریک اقتدار ہوئے تو وہ اپنا وعدہ بھول گئے۔ اگر وہ اپنے اس وعدے پہ دیانتداری سے عمل کرتے، تو آج ملک کی حالت دوسری ہوتی۔ سندھ میں زمینداری نظام کے ساتھ، ایک نئے عنصر کی شمولیت سے صورتِ حالات اور زیادہ خراب ہو گئی اور یہ عنصر پنجاب کے لوگوں کو سندھ میں بڑے بڑے قطعات کی الاٹمنٹ تھی۔ سندھی کاشتکار کی حالت پہلے ہی خراب تھی اور وہ وہاں کے وڈیروں کے خلاف منظم ہو رہے تھے، وڈیروں نے اپنے مفاد کی حفاظت کیلئے سندھی کاشتکاروں کی ناراضگی کو پنجابی زمینداروں کی طرف موڑ دیا۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے ہر اس اقدام کی معاونت کی جس سے ان کا مفاد محفوظ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان پہ یہ الزام بھی لگایا جا رہا ہے کہ وہ سندھ میں ڈاکوؤں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ بعض سندھی ڈاکوؤں کے جو انٹرویو اخبارات و رسائل میں چھپے ہیں ان کے مطابق انہوں نے یہ آخری قدم اس لئے اٹھایا کہ وہ اپنے استحصال کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال اس ساری صورتِ حالات سے وہاں کے غریب کسانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔ بلکہ اب تو اس قسم کی رپورٹیں آ رہی ہیں، کہ کمیونسٹ ان لوگوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس مقصد کے لئے، سندھی زبان میں کافی کمیونسٹ لٹریچر تیار کیا جا چکا ہے۔

ہم دن رات اسلام، اسلام کا نام لیتے نہیں تھکتے لیکن جب ہمیں سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تو پھر ہمارے علمائے کرام یہ نہیں بتا سکتے کہ ایسے سنگین مسائل کا اسلام کیا حل پیش کرتا ہے۔ علماء کی اس ذہنیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ پرویز صاحب لکھتے ہیں :۔

آپ کسی مسجد کے منبر سے سنیئے یا جلسہ گاہ کی اسٹیج سے، ہر مقام اور ہر گوشہ سے یہ آواز آپ کے کانوں تک آئے گی کہ اسلام ایسی تعلیم پیش کرتا ہے کہ جس کی مثال اور نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی وہ ایسا ضابطۂ حیات ہے کہ اگر ساری دنیا کے مفکرین سیاسیئن اور مصلحین اکٹھے ہو جائیں تو بھی اس جیسا مکمل ضابطۂ حیات مرتب کرنا تو ایک طرف وہ اس کی کسی ایک شق کے مثل بھی مدون نہیں کر سکتے۔ یہ نوعِ انسانی کی تمدنی معاشرتی، سیاسی، اجتماعی اور انفرادی مشکلات کا واحد حل ہے۔ یہ دعویٰ جس کی صداقت میں کوئی کلام نہیں۔ آپ کو ہر گوشے سے سنائی دے گا، لیکن اگر آپ ان حضرات سے پوچھیں کہ اسلام کی وہ کونسی تعلیم ہے جو بے مثل و بے نظیر ہے اور جس کی مثال دنیا بھر کے مفکرین اکٹھے ہو کر بھی پیدا نہیں کر سکتے تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ ان کے ہاں سے اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل سکے گا۔ وہ اگر کہیں گے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ بد دیانتی نہ کرو۔ بے انصافی نہ کرو۔ وغیرہ

(نظامِ ربوبیت ص ۱۷)

چنانچہ اسلام کی تعلیمات سے لاعلمی کی بناء پر، یہ لوگ ملک میں فساد پیدا کرنے والے اصل مسئلہ کی نشاندہی کرنے کی بجائے، پہلے کی طرح ہندوؤں پر الزام لگا کر، ایک دفعہ پھر نظامِ جاگیرداری کو بچانے کی سعی لاحاصل کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس کے جس اسلامی حل کی طرف علامہ پرویز صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ وہ نیا نہیں بلکہ ہر اسلامی دور میں اس پر کسی نہ کسی صورت میں عمل ہوتا رہا ہے۔ اور علامہ پرویز صاحب نے جو بات قرآن مجید کے حوالے سے بیان کی ہے، ہمارے فقہاء دوسرے حوالوں سے اسے بیان کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک عملی مسئلہ تھا۔ اس لئے کوئی بھی اس سے انکار نہ کر سکا۔

اسلامی فقہ کے مطابق بھی دنیا میں فساد کی جڑ یہی ملکیت والا چکر ہے چنانچہ ابتدائی زمانے کے تمام مسلمان فقہا کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اسلامی ریاست میں نہ تو کوئی زمین خریدی جا سکتی ہے اور نہ ہی بیچی جا سکتی ہے اور جیسا کہ پرویز صاحب نے نظامِ ربوبیت میں فرمایا ہے۔ صرف اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور اس کی عملی مثال خود رسول اللہ صلعم نے قرآن مجید کی تعلیمات کی تشریح کرتے ہوئے امتِ مسلمہ کے سامنے پیش کی۔ احادیث میں آیا ہے۔ کہ جب قرآنِ مجید میں سود کے حرام ہونے کے احکامات نازل ہوئے تو آپؐ نے

اس وقت کے تمام معاملات کا تفصیلی جائزہ لیا۔ جائزہ لینے کے بعد آپؐ نے زمین کی بٹائی کے معاملے کو سود قرار دے کر، مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا۔ چنانچہ جن مسلمانوں کے پاس اپنی کاشت سے زیادہ اراضی تھی، انہوں نے وہ زائد اراضی بغیر کسی قیمت کے اپنے ضرورتمند بھائیوں کے حوالے کر دی۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم نے کسی صورت میں اراضی کو فروخت کرنے کی اجازت نہ دی۔ (ملاحظہ ہو سنن ابو داؤد جلد سوم ص ۳۵۵ و نیل الاوطار جلد پنجم ص ۲۹۵)

بعد میں مسلمانوں نے جو علاقے فتح کئے جن میں پاکستان بھی شامل ہے تو ان تمام علاقوں کی اراضی کو اسلامی بیت المال کی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ ہندوستان میں ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی اور اس سارے دور میں اس اسلامی قانون پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن جب انگریزوں نے برّصغیر کو فتح کیا تو انہوں نے بنگال کے بندوبست دوامی کے ذریعے، زمین کی نگرانی کرنے والوں کو ان کا مالک بنا دیا۔ اس سے برطانوی حکومت کو اپنی جڑیں مضبوط کرنے کا موقع ملا۔

اسلامی قانون کے مطابق، مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اگر دشمن ان کے کسی علاقے پر قبضہ کرے تو وہ اسے دشمن سے فوراً واپس لینے کی کوشش کریں، واپسی کے بعد، اس کی پہلی اسلامی حیثیت بحال ہو جائے گی۔ (فتاوٰی عالمگیری جلد سوم ص ۵۳۸)

علامہ پرویز صاحب یہی بات قرآن مجید کے حوالے سے کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست کی تمام اراضی، ریاست کی ملکیت ہوتی ہے اور فقہا بھی یہی کچھ کہتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید تو خیر دُور کی بات ہے۔ ان علماء حضرات نے اپنی فقہ کی کتابوں کا بھی کبھی مطالعہ نہیں کیا۔

فقہ کے اس قانون کے مطابق قیام پاکستان کے بعد، یہاں کی اراضی کی شرعی حیثیت بحال ہو چکی ہے اور اسلامی قانون کے مطابق یہ حکومتِ پاکستان کی ملکیت ہیں۔ لیکن نامعلوم وجوہات کی بناء پر اس اسلامی قانون پر ابھی تک عمل نہیں کیا گیا۔ ہمارے علماء حضرات بھی یا تو اس مسئلہ سے لاعلمی کی بناء پر یا جاگیرداری کو بچانے کے لئے اس اسلامی قانون کا نام نہیں لیتے۔ لیکن زمانے کے تقاضے ہمیں مجبور کر رہے ہیں، کہ ہمیں اس اسلامی قانون پر عمل کرنا ہوگا۔

مشرقی پاکستان میں اس اسلامی قانون پر عمل کرتے ہوئے، وہاں پر زمین کی اسلامی حیثیت کو بحال کر کے اسے صرف کام کرنے والے کاشتکاروں کے حوالے کیا جا چکا ہے۔ جس سے وہاں کے کسان آسودہ ہو چکے ہیں اور وہ کسی قسم کی سیاسی ایجیٹیشن میں حصہ نہیں لیتے۔ سندھ میں بھی اس اسلامی قانون کے نفاذ کی فوری ضرورت ہے۔ اس سے وہاں کے حالات معمول پر آجائیں گے اور جب ڈاکوؤں کی سرپرستی کرنے والا کوئی باقی

نہیں رہے گا تو آہستہ آہستہ ان کا بھی خاتمہ ہو جائے گا بلکہ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہمیں اس اقدام کو صرف سندھ تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہیئے، بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس پر عمل کیا جائے۔ اس سے فساد کی وہ جڑ کٹ جائے گی جسے علامہ پرویز صاحب کی فکر کے مطابق قرآن مجید نے ان تین الفاظ میں بیان کیا ہے :-

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (البقرہ - ۳۶)

بقیہ قائداعظم (صفحہ ۶۱ سے آگے)

ظلم کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ (وہ سب کو اپنی پیٹ میں لے لیا کرتا ہے)۔

یاد رکھو! خدا کے قانونِ مکافات کا مواخذہ بڑا سخت ہوتا ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف (ضربِ کلیم ص۸)

ملوکیت، سرمایہ داری، تھیاکریسی، ملت کے وہ گناہ ہیں، جو کبھی معاف نہیں ہو سکتے۔ یہ گناہ قوموں کو لے ڈوبتے ہیں۔ اور جب قوم ڈوب جائے تو افراد کیسے بچ سکتے ہیں؟

(بقیہ حقائق و عبر صفحہ ۴۰ سے آگے)

اس پہلو سے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ہمارے ملک میں درجنوں ایسی کتابیں بک رہی ہیں، جن میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ ایران کا انقلاب صرف ایک شیعہ انقلاب ہے۔ لیکن میں اس اقدام کو اسلام کے خلاف جہانِ کفر کی سازش کا نام دیتا ہوں۔ جو لوگ اس قسم کی کتابیں لکھ رہے ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔

اگر ایران کا انقلاب شیعہ انقلاب ہے تو پھر صدیوں بعد بھی اسلامی انقلاب نہیں آسکتا۔ کیونکہ انقلاب کے بانی کا کسی نہ کسی ملک سے ضرور تعلق ہوگا۔ پھر ہم کسی انقلاب کو اسلامی انقلاب نہیں کہہ سکیں گے۔ ایران کا انقلاب واقعتاً اسلامی اور خالص اسلامی انقلاب ہے۔

قارئین طلوع اسلام کو مژدہ مفکرِ قرآن علامہ پرویز صاحبؒ کی معرکہ آرا تصنیف جو کئی سال سے نایاب تھی، کا تازہ ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ دورِ حاضر کے انسان کے ذہن میں اٹھنے والے بیشتر سوالات کا تعلق مسئلہ تقدیر سے ہے جس نے اسے ہمیشہ طلسم پیچ و تاب بنائے رکھا اور جسے صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے کارل مارکس جیسے مفکر نے کہہ دیا تھا کہ مذہب عوام کیلئے افیون ہے۔ محترم پرویز صاحبؒ نے اس مشکل ترین مسئلہ کو اپنی مذکورہ ذیل کتاب: **کتاب التقدیر** میں قرآن کریم کی روشنی میں اس عمدگی سے حل کر دیا ہے کہ ذہن میں کوئی خلجان باقی نہ رہے۔ کتاب بڑے سائز کے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ جلد مضبوط اور گرد پوش جاذبِ نگاہ قیمت ساٹھ روپیے ۶۰/- (علاوہ محصول ڈاک) (ادارہ)

حضور رسالتمآبؐ کی کہانی ۔ خدائے برتر کی زبانی

(عیدِ میلادالنبیؐ پر تقریر) (پرویزؒ)
(اکتوبر ۱۹۶۰ء)

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

خدا نے مخلوق کو پیدا کیا تو اس کی پرورش کا ذمہ بھی خود ہی لیا ۔ اسے خدا کی ربوبیت کہتے ہیں ۔ حیوانات تک یہ پرورش محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کی ہوتی ہے ۔ اس کے لئے خدا نے صفحۂ ارض پر سامانِ رزق کو پھیلا دیا اور ساتھ ہی ہر نوع (SPECIES) کو وہ ہدایات (DIRECTION) دے دیں جن کے مطابق وہ سامانِ رزق سے مستفید ہو سکتی ہے ۔ یہ ہدایات، ہر نوع کے ہر فرد کے اندر پیدائش کے ساتھ ہی رکھ دی جاتی ہیں ۔ انہیں جبلّت (INSTINCT) کہتے ہیں ۔ یہی وہ جبلّت ہے جس کی رُو سے (مثلاً) بطخ کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی پانی کی طرف لپکتا ہے اور مرغی کا چوزہ خشکی کی طرف دوڑتا ہے ۔ یا بکری گھاس کھاتی ہے ۔ گوشت کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی ۔ اور شیر گوشت کھاتا ہے گھاس کی طرف تکتا نہیں خواہ وہ بھوکوں کیوں نہ مر جائے ۔

انسانی ہدایت کا سرچشمہ

انسان کو دوہری زندگی ملی ہے ۔ ایک تو وہی طبیعی زندگی (اس کے جسم کی زندگی) جو ہر حیوان کو ملی ہے ۔ اور دوسری "انسانی زندگی" جو کسی حیوان کو نہیں ملی ۔ جہاں تک اس کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے، انسانی بچے کو بھی اس امر کی ہدایت پیدائش کے ساتھ ہی مل جاتی ہے کہ وہ بھوک کے وقت کس طرح اپنے رزق (دودھ) کے چشموں سے فائدہ اٹھائے ۔ اس چیز کے لئے اسے کسی خارجی ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ لیکن جہاں تک اس کی انسانی زندگی کا تعلق ہے، اس

کے لئے انسان کے اندر کوئی ہدایت نہیں ہوتی۔ یہ ہدایت اسے خارج سے ملتی ہے۔ اس ہدایت کا طریق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص انسان کو یہ ہدایت بذریعہ وحی عطا کرتا ہے۔ (اسے خدا کا نبی یا رسول کہتے ہیں) اور وہ اس ہدایت کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ انسانوں کے لئے اس طریقِ ہدایت کو اختیار کرنے میں ایک خاص مصلحت تھی۔ جو ہدایت کسی کے اندر پیدائشی طور پر رکھ دی جاتی ہے، وہ اس ہدایت کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بکری گھاس کے کھانے پر اور مچھلی پانی میں تیرنے پر مجبور ہے۔ وہ اس کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی۔

لیکن انسان کو خدا نے صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس سے یہ حیوانات سے ممتاز ہے۔ اگر یہ ہدایت اس کے اندر رکھ دی جاتی تو یہ بھی (حیوانات کی طرح) اس پر چلنے کے لئے مجبور ہوتا۔ اور اس طرح اس کا اختیار وارادہ باقی نہ رہتا۔ یعنی یہ بھی حیوانات کی سطح پر آجاتا۔ اس لئے، اس کی صورت میں، خدا نے یہ کیا کہ اس کی طرف ہدایت (بذریعہ انبیاء کرامؑ) خارج سے بھیجی اور اس سے کہہ دیا کہ یہ چاہے تو اختیار کرلے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ اگر یہ اسے اختیار کرلے گا تو اس کے شرفِ انسانیت کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اگر یہ اس سے انکار کر دے گا تو حیوانی سطح پر رہ جائے گا اور اس کی زندگی جہنمی ہو جائے گی۔

آخری ہدایت

جن حضرات (انبیاء کرامؑ) کی وساطت سے خدا کی ہدایت دوسرے انسانوں تک پہنچتی تھی وہ پہلے خود اس ہدایت پر عمل کرتے تھے اور ان کا یہ عمل دوسروں کے لئے نمونہ بن جاتا تھا۔ آسمانی ہدایت کا یہ سلسلہ حضرت نوحؑ سے شروع ہوا اور نبی آخرالزماں، محمد رسول اللہ پر جاکر ختم ہوگیا[1]۔ یعنی خدا نے جو ہدایت نوعِ انسانی کو دینی تھی وہ قرآن کریم میں تکمیل تک پہنچ گئی۔ جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اس لئے اس کے بعد کسی مزید آسمانی ہدایت کی ضرورت نہ رہی۔ اور جب کسی مزید ہدایت کی ضرورت نہ رہی تو کسی ہدایت لانے والے (نبی یا رسول) کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اس لئے قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور نبی اکرمؐ خدا کے آخری نبی ہیں۔

قرآن کریم نے جہاں یہ بتایا ہے کہ جو ہدایت اس میں دی گئی ہے اصولی طور پر وہی ہدایت پہلے انبیائے کرام کو بھی دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سابقہ انبیائے کرامؑ کے زندگی سے

---

[1] قرآن کریم نے بتایا ہے کہ آسمانی ہدایت کا یہ سلسلہ اقوامِ عالم میں جاری رہا تھا اور کوئی بستی ایسی نہیں گزری جس میں خدا کا رسولؐ نہ آیا ہو لیکن اس نے تفصیلی طور پر صرف سامی اقوام کے انبیائے کرامؑ کا ذکر کیا۔ کیونکہ قرآن کریم کی اولین مخاطب قوم، ان انبیائے کرامؑ سے واقف تھی اور وہ خود بھی سامی اقوام سے تھی۔

احوال وکوائف بیان کرکے یہ بتایا ہے کہ انہوں نے اس ہدایت کو کس طرح پیش کیا اس پر کس طرح عمل کرکے دکھایا۔ اور ان کی قوم کی طرف سے ان کی دعوت کا کیا جواب ملا۔ جس طرح اس نے انبیائے سابقہ کے متعلق یہ کچھ بتایا ہے اسی طرح اس نے خود نبی آخر الزمانؐ کے متعلق بھی یہ کچھ بیان کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ کچھ اس شرح وبسط سے بیان ہوا ہے کہ ان درخشندہ موتیوں کو ایک لڑی میں پرو لیا جائے تو اس سے سیرتِ نبی اکرمؐ کی سلکِ گہردار نہایت آب وتاب سے مرتب ہوکر سامنے آجاتی ہے۔

قرآنی سیرت

میں نے اپنی کتاب (معراجِ انسانیت) جو بڑے سائز کے قریب نوسو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، حضورؐ کی سیرت کو قرآنی آیات کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ ذیل کی سطور میں اسی تفصیل کو سمٹائی ہوئی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اپنی اس کوشش کو تمام کو عید میلاد النبیؐ کی تقریب سعید پر تحفتہً پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ آسان زبان میں پیش کیا جائے۔ کیونکہ احباب کا تقاضا ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے قرآنی خط وخال سلیس زبان میں سامنے لانے چاہئیں تاکہ اس سے ہمارا کم تعلیم یافتہ طبقہ بھی مستفید ہوسکے۔

نبوّت کوئی ایسی چیز نہیں جسے انسان اپنے کسب وہنر سے محنت کرکے حاصل کرلے۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے، جسے یہ خصوصیت عطا کی جانی مقصود ہوتی تھی اس کی شروع سے تربیت خود اللہ تعالیٰ کی زیرنگرانی ہوتی تھی۔ اس شخص کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا تھا کہ اسے نبوّت کے لئے تیار کیا جارہا ہے۔ لیکن اس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے زمانے کی غلط باتوں سے متنفر ہوجاتا تھا۔ اسے حقیقت کا علم تو نہیں ہوتا تھا لیکن باطل کی باتوں میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ وہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا تھا۔ یہی وہ کیفیت ہے جس سے

تلاشِ حقیقت میں سرگرداں

قرآنِ کریم نے سب سے پہلے نبی اکرمؐ کا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ (۹۳/۷)

ہم نے تجھے (تلاشِ حقیقت میں) سرگرداں پایا تو راستہ دکھادیا۔

اس کیفیت تک پہنچنے کے لئے ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ ہے، سرزمینِ حجاز کا سب سے بڑا اور مشہور شہر مکّہ، اپنی تمام جاذبیتوں کے ساتھ، وہاں کے باشندوں اور باہر والوں کے لئے مرکزِ توجہ بن رہا ہے۔ اس توجہ کی بنیادی وجہ خانۂ کعبہ ہے جس کا حقیقی مقصد تو انکی نگاہوں سے اوجھل ہوچکا ہے۔ لیکن اس کی عقیدت لوگوں کو

دُور دُور سے اس کی طرف کھینچے لئے آتی ہے۔ یہ لوگ فرطِ عقیدت میں اس کے گرد جمع ہیں۔ کوئی تالیاں پیٹتا ہے۔ کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی جذب و کیف کے عالم میں اس کے گرد گھومتا ہے۔ کوئی ناچتا ہے کوئی کودتا ہے۔ کوئی بتوں کے استھانوں پر جانور ذبح کرکے ان کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا مصروف بادہ پرستی ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو اُن سے اپنے فسانۂ عشق و محبت کا انجام معلوم کرنا چاہتی ہے۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیان اپنی سحر آفرینیوں سے سننے والوں کی ناک میں نکیل ڈالے جس وادی میں چاہتے لئے لئے پھرتے ہیں۔ وہ کسی کے دل میں افسونِ محبت پھونکتے ہیں اور کہیں آتشِ انتقام کے شعلے بلند کرتے ہیں

لیکن مکہ کی انہی گلیوں میں ایک ایسا شخص بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان کا نظر نہیں آتا۔ اسے نہ حریم کعبہ کی ان ہنگامہ آرائیوں میں کوئی جاذبیت دکھائی دیتی ہے نہ عکاظ کی رستاخیزیوں میں کوئی کشش۔ وہ اَن پڑھ ہے لیکن عیسائی راہبوں اور یہودی عالموں کے پاس جاتا ہے کہ شاید انہی سے حقیقت کا سراغ مل جائے۔ وہ وہاں سے دل برداشتہ اٹھتا ہے تو صحرا کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے۔ اور کائنات کی نیرنگیوں پر غور و فکر کرتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کی ہر مجلس میں جاتا اور کائنات

عروسِ حقیقت کی بے نقابی کے ہر گوشے میں گھومتا ہے کہ کہیں سے اُسے وہ شے مل جائے جس کا اسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے لیکن ہر مقام سے یہ کہتا ہوا ناکام لوٹتا ہے کہ

تلاشی جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

وہ اسی طرح مضطرب و بے قرار پھرتا ہے کہ ایک شب لیلائے حقیقت یک بیک اس کے سامنے نمودار ہو جاتی ہے۔ اور اپنے حسین چہرے سے پول نقاب اٹھاتی ہے کہ اس کے تبسم سے کائنات جگمگا اٹھتی ہے یہ رمضان کا مہینہ تھا (۲/۱۸۵)[1] اور ایسی مبارک رات جس میں خدا کی حکمتِ بالغہ سے حق و باطل نکھر کر الگ الگ ہو گئے۔ اور نوعِ انسانی کو زندگی کی نئی اقدار مل گئیں۔ (۴۴/۱ ز ۹۷/۱)[2]

یوں خدا کی وحی اس پر نازل ہوئی جو جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے

عطائے وحی وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ۔ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ

---

[1] شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (۲/۱۸۵)

[2] اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ۔ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ (۴۴/۱) اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷/۱)

مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (۴۲/۵۲) نہ وہ جانتا تھا اور نہ ہی اسے اس کی کوئی توقع تھی۔

وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْۤا اَنْ یُّلْقٰۤی اِلَیْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (۲۸/۸۶)
وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ..... (۴/۱۱۳)

یوں اس متلاشیٔ حقیقت کو نبوّت عطا ہوگئی اور اسے وہ کچھ سکھا دیا گیا جسے وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔

یہ حاملِ نبوّت یتیم بھی تھا اور غریب بھی۔ (اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ..... وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ..... (۹۳/۶تا۸) نیز نبوّت سے پہلے، ان پڑھ بھی۔ (وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ ..... (۲۹/۴۸)

یوں اس بے یار و مددگار، یتیم، غریب اور نادار، ان پڑھ۔ صحرانشین کو تمام عالمِ انسانیت کا سب سے بڑا معلم بننے کے لئے منتخب کیا گیا۔

نبوّت کی ذمہ داریاں

عام طور پر یہ خیال کیا جائے گا کہ جب اس شخصؐ نے وہ کچھ پا لیا جس کی اُسے تلاش تھی تو پھر وہ زندگی کے باقی دن آرام و سکون سے بیٹھ رہا ہوگا۔ اس لئے کہ جب مقصد حاصل ہو جائے تو پھر جدوجہد ختم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر تو یہی ہوتا ہے لیکن نبی کی کیفیت عام لوگوں سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ اسے نبوّت تو بلا مزدو معاوضہ ملتی ہے لیکن اس پہ ذمہ داریاں اس قدر عائد کی جاتی ہیں جن سے اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ (وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِیْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (۹۴/۲تا۳)

چنانچہ منصبِ نبوّت پہ سرفراز کئے جانے کے بعد، نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ یَاۤ اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ اے وہ کہ جس کے ذمہ نظامِ عالم کو درست کرنا ہے قُمْ۔ اُٹھ۔ فَاَنْذِرْ۔ اور لوگوں کو غلط نظامِ زندگی کے تباہ کُن نتائج سے آگاہ کر۔ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ (۷۴/۱تا۳) اور ساری دنیا میں اعلان کر دے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آذری!

ظاہر ہے کہ جس دعوت سے مراد یہ ہو کہ انسانوں کے نظامِ کہن کی بساط الٹ کر اس کی جگہ ایک جدید نظام قائم کیا جائے اس دعوت کی مخالفت ہر طرف سے ہوگی۔

دنیا کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص غیروں کی مخالفت مول لیتا ہے وہ اپنوں کو اپنے ساتھ ضرور رکھتا ہے۔ اس کا اپنا قبیلہ اور خاندان ہوتا ہے۔ جو دوسروں کی مخالفت میں اس کا پشت و پناہ بنتا ہے، وہ انہی کی مدد اور حمایت کے بھروسہ پر دوسروں کے خلاف اٹھتا ہے۔ لیکن آسمانی انقلاب کے داعی کا انداز، اس باب میں بھی دنیا جہان سے نرالا ہوتا ہے۔ اس سے

کہا جاتا ہے کہ اس دعوت کا آغاز ہی اپنے خاندان اور قبیلے سے کرو۔
وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶/۲۱۴)

سلسلۂ دعوت

اے رسولؐ! اپنے قریبی رشتہ داروں کو، انکی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرو۔ اس کے بعد آگے بڑھو۔ اور ہمارے اہلِ مکہ اور اس کے گرد و نواح کی آبادیوں تک اس دعوت کو پہنچاؤ۔ (وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا ..... (۴۲/۷) اس کے بعد اس سلسلہ کو اور وسیع کرو اور پوری کی پوری عرب قوم کو اس کے دامن تلے لے آؤ۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ..... (۱۳/۳۰)

اور اسی طرح ہم نے تجھے ایک ایسی قوم کی طرف بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی قومیں ہوگزری ہیں (بھیجا اس لئے ہے) تاکہ جو بات تجھ پر وحی کی گئی ہے تو اسے انکے سامنے پیش کر دے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدائے رحمٰن کا انکار کرتے ہیں (تو انہیں اس پر ایمان کی دعوت دے)۔

اور اس کے بعد اس سلسلے کو ایسا حدود فراموش کر دے کہ یہ تمام نوعِ انسانی کو اپنے آغوش میں لے آئے

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (۷/۱۵۸)

یہ تھیں وہ عظیم ذمہ داریاں جو نبوت عطا ہونے پر اس ذاتِ گرامی پر عائد کی گئیں۔ سوال یہ ہے

یہ دعوت کیا تھی؟

کہ یہ دعوت کیا تھی جسے اس طرح عام کرنے کے لئے اس قدر تاکید کی جارہی تھی؟ یہ دعوت کوئی نئی دعوت نہیں تھی یہ وہی دعوت تھی جو ہر آسمانی انقلاب لانے والے (نبی) کے ذریعے انسانوں تک پہنچائی گئی تھی۔ یعنی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ (۷/۵۹) محکومیت صرف خدا کے قوانین کی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے۔ یعنی

لا الٰہ ۔ الا اللہ

دیکھنے میں تو یہ چار لفظ ہیں لیکن ان میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر آگئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ (۱۲/۴۰) خدا کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسانوں پر اپنا حکم چلائے۔ دنیا میں اقتدار صرف قوانینِ خداوندی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار و اختیار نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت تھی محکوموں کو حاکموں کے استبداد سے نجات دلانے کی۔ یہ دعوت تھی مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے رہائی دلانے کی۔ یہ دعوت تھی ان زنجیروں کو توڑنے کی جن میں ناتواں انسانیت جکڑے چلی آرہی تھی اور اس کے سر سے اس بوجھ کو اتارنے کی جس کے نیچے وہ بری طرح کچلی جارہی تھی۔ (وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ

الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ ۔ (۷/۱۵۷)

اعلانِ جنگ

اور دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ دعوت، دنیا کے ہر صاحبِ اقتدار وذی اختیار کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ اسلئے ان کا اس دعوت کے خلاف محاذ بنا کر اُٹھ کھڑے ہونا بالکل فطری تھا۔ اس میں ایک طرف اربابِ حکومت تھے تو دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے علمبردار۔ دائیں کو سرمایہ داروں کا گروہ تھا۔ تو بائیں کو فریب کاروں کا۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ (۲۵/۳۱) اور اس طرح انسانیت کی عدالت کے مجرمین آسمانی دعوت لانے والے نبی کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ یہ سرکشی اور مخالفت اس لئے ہوتی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے پاس بڑی دولت ہے۔ اور ہمارا جتھہ بھی بہت بھاری ہے۔ اس لئے ہم پہ کون ہاتھ ڈال سکتا ہے؟ وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ (۳۴/۳۵)۔ قرآن انہیں مترفین کا گروہ کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی وہ تن آسان جو دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں۔ آسمانی انقلاب کی دعوت جب اور جہاں بھی بلند ہوئی اس طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ وَمَا اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ (۳۴/۳۴)۔ "ہم نے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا کہ وہاں کے تن آسان خوشحال طبقہ کی طرف سے اس کے پیغام کی مخالفت نہ ہوئی ہو۔ یہی وہ طبقہ تھا جس کی طرف سے نبی اکرمؐ کی دعوت کی مخالفت ہوئی۔ اسی طبقہ کا وہ نمائندہ تھا جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ وَجَعَلْتُ لَہٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا وَّبَنِیْنَ شُھُوْدًا (۷۴/۱۲-۱۳) ہم نے اسے فراواں دولت اور (کثیر) بیٹے دیئے تھے جو وہاں موجود تھے وَمَھَّدْتُّ لَہٗ تَمْھِیْدًا (۷۴/۱۴)۔" اور میں نے اس کے تمام معاملات درست کر رکھے تھے بڑا ساز وسامان دے رکھا تھا۔ یہی تھا جس نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا کہ فَقَالَ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ۔ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۔ (۷۴/۲۴-۲۵) یعنی رسولؐ اللہ کا یہ دعویٰ کہ انہیں خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے غلط ہے۔ یہ (معاذ اللہ) جھوٹ ہے جو یونہی چلا آرہا ہے۔ یہ صرف انسانی کلام ہے۔ چنانچہ کبھی آپ کو ساحر کہا گیا اور کبھی کذّاب۔ کبھی شاعر کبھی مجنوں۔ وہ اس دعوت کی مخالفت دلیل وبرہان کی رُو سے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ عوام کو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ شخص تمہیں تمہارے اسلاف کے مسلک سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ یہی ان کی دلیل تھی اور یہی برہان۔ وَکَذٰلِکَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔ (۴۳/۲۳) "اے رسول! جس طرح آج مکہ کے سردار تمہاری مخالفت میں سرگرم ہیں۔ اسی طرح تجھ سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے جس آبادی کی طرف اپنا

مخالفت

رسول بھیجا نہ وہاں کے مترفین نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم اس نئی دعوت کو ماننے کیلئے تیار نہیں، ہم نے اپنے اسلاف کو ایک روش پہ چلتے دیکھا ہے اور ہم انہی کے نقوشِ قدم کی پیروی کرتے چلے جائیں گے لیکن انہیں اس دلیل کی کمزوری کا احساس تھا اور اس امر کا یقین تھا کہ جس شخص نے ایک مرتبہ بھی قرآن کو توجہ سے سُن لیا تو وہ ضرور اس پہ ایمان لے آئے گا۔

قرآن مت سنو

اس لئے وہ اپنے لوگوں کو تاکید کرتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ (۴۱/۲۶) اس قرآن کو مت سنو۔ جہاں اس کی تعلیم دی جارہی ہو وہاں شور مچادو۔ یہی ایک طریق ہے جس سے شاید تم اس نئی تحریک پہ غالب آسکو۔

قرآن کے متعلق تو وہ یہ کہتے اور خود رسولؐ اللہ کے متعلق لوگوں کو یہ کہہ کر بہکاتے کہ ذرا دیکھو تو سہی۔ یہ کس قسم کا رسولؐ ہے کہ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ۔ عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا ہے۔ اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، رسولؐ کو عام انسانوں سے الگ قسم کا ہونا چاہیئے۔ اس کے پاس مافوق الفطرت قوتیں ہونی چاہئیں۔ اگر اس پہ خدا کی وحی نازل ہوتی ہے تو لَوْلَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا (۲۵/۷) ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے پاس کوئی فرشتہ آتا اور وہ اس کے ساتھ لوگوں کو ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرتا۔ اس طرح ساری دنیا دیکھ لیتی کہ واقعی اس کی طرف فرشتے خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں؟ وہ توہم پرستی کا زمانہ تھا۔ اس لئے لوگوں کا ان کے اس بہکاوے میں آجانا لازمی تھا۔ چنانچہ

سب سے بڑا معجزہ

لوگ حضورؐ کے پاس آتے اور آپؐ سے کہتے کہ آپؐ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ خدا کے رسولؐ ہیں۔ آپؐ ان کی ان باتوں کو صبر و سکون سے سنتے۔ اور ایک تبسم جاں نواز سے ان سے کہتے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶) میں کہیں سے باہر نہیں آیا کہ تمہیں میرے متعلق کچھ علم نہ ہو۔ میں نے اس دعویٰ نبوت سے پہلے ایک عمر تمہیں لوگوں میں گزاری ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ کیا میری زندگی تمہیں یہی بتاتی ہے کہ میں جھوٹا اور فریب کار ہوں؟ تم ذرا عقل و فکر سے کام لو۔ اور سوچو کہ جھوٹے کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے؟

اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یہ وہ معجزہ تھا جس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ لیکن مفاد پرست گروہ کے دل میں اس سے مخالفت کی آگ اور بھی زیادہ تیز ہو جاتی تھی چنانچہ اب انہوں نے، الزام تراشی اور تہمت بافی سے آگے بڑھ کر، دست درازی بھی شروع کر دی۔ قرآن کریم نے اس مخالفت کی تفصیل کو چار لفظوں کے اجمال میں یوں سمٹا دیا ہے کہ وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (۷۲/۱۹)۔ "اور جب اللہ کا

یہ بندہ خدا کو پکارنے کے لئے اٹھا تو قریب تھا کہ مخالفین چاروں طرف سے یورش کر کے اس سے لپٹ جائیں۔

استقامت کی تلقین

جوں جوں ادھر سے مخالفت کی شدت بڑھتی جاتی تھی، خدا کی طرف سے آپؐ کو استقامت اور استقلال کی تاکید زیادہ ہو جاتی تھی۔ کبھی کہا جاتا اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ — (۳۸/۱۷) جو کچھ یہ تم سے کہتے ہیں اس پر استقلال و استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ لَا یَسْتَخِفَّنَّکَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ (۳۰/۶۰) تم اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں مستقل مزاجی سے کام لو اور اس حقیقت پر یقین رکھو کہ خدا نے تم سے جو وعدہ کر رکھا ہے کہ آخر الامر تمہارا مشن کامیاب ہوگا وہ بالکل سچا ہے اور یاد رکھو تم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے تم ان مخالفین کی نظروں میں ہلکے ہو جاؤں۔ استقامت سے کام لو اور انکی حرکات سے دل برداشتہ ہو کر اپنی کوششوں میں کمی نہ ہونے دو جن سے تم ان لوگوں کو تباہی سے بچانا چاہتے ہو۔ وَ ذَکِّرْ بِہٖ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا کَسَبَتْ۔ (۶/۷۰) اور قرآن کے ذریعہ لوگوں کو نصیحت کرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بدعملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے۔ فَلِذٰلِکَ فَادْعُ۔ وَ اسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ وَ لَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ (۴۲/۱۵)۔ تو اسی طرح انہیں صحیح نظام زندگی کی طرف دعوت دیتا رہ اور جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے استقامت و عزیمت سے اس راہ پر جما رہ اور ان مخالفین کی خواہشات کا اتباع مت کر۔ وَ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰی اِلَیْکَ وَاصْبِرْ۔ (۱۰/۱۰۹) جو کچھ تجھ پر وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کئے جاؤ اور اپنی راہ پر استقامت سے قائم رہو۔ تم بھی اور وہ لوگ بھی جو اپنی غلط روش کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں۔ فَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَکَ۔ (۱۱/۱۱۲) ثابت قدم رہو اور اپنی تگ و تاز کو تیز تر کرتے جاؤ۔ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِھَا وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّھَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰی۔ (۲۰/۱۳۰) جو کچھ یہ تیرے خلاف کہتے (اور کرتے) ہیں، تم اس پر ہمت نہ ہارو۔ ثابت قدم رہو اور اپنے نشوونما دینے والے کے پروگرام کو وجۂ حمد و ستائش بنا کر دکھانے میں پوری تگ و تاز سے کام لو۔ صبح شام۔ راتوں کے اوقات میں۔ اطراف نہار میں۔ غرضیکہ دن رات اس پروگرام کی تکمیل میں مصروف جدوجہد رہو۔ تاکہ اس طرح تم اس کے خوشگوار نتائج کو اپنے سامنے دیکھ کر خوش ہو جاؤ۔

جب مخالفین نے دیکھا کہ اتنی شدید مخالفت کے باوجود، اس جماعت کی تگ و تاز میں کوئی فرق نہیں آتا اور یہ تحریک آگے ہی بڑھتی جا رہی ہے تو جیسا کہ بساطِ سیاست کے مہرہ بازوں کا قاعدہ ہے انہوں نے چاہا کہ آپؐ سے مفاہمت (COMPROMISE) کر لی جائے۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۶۸/۹)

مفاہمت کی کوشش

ان کی یہ خواہش ہے کہ اگر تم کچھ مداہنت برتو۔ اپنے مقام سے تھوڑا سا پھسل جاؤ۔ تو یہ بھی مداہنت سے کام لیں۔ ظاہر ہے کہ قرآنی نظام میں ان لوگوں کی مفاد پرستیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ یا تو باہمی مفاہمت سے اس نظام کی جگہ کوئی دوسرا نظام قائم کر لیا جائے یا قرآنی نظام میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جس سے ان کی مفاد پرستیوں کے لئے کچھ گنجائش نکل آئے، وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (۱۰/۱۵) جب ان کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو جو لوگ ہمارے سامنے آنے کی امید نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ۔ یا اس میں ہماری حسب منشا تبدیلی کر دو۔ تو پھر ہم آپ سے مصالحت کر لیں گے۔ اس "پیشکش" کے جواب میں آپ سے کہا گیا کہ فَلَا تَطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ۔ (۶۸/۸) ان جھٹلانے والوں کی بات ہرگز نہ ماننا۔ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ..... (۱۱/۱۱۳) ان ظالمین کی طرف ذرا سا بھی نہ جھکنا۔ ان سے کہہ دو کہ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (۱۰/۱۵) میری کیا طاقت ہے کہ میں اپنی طرف سے قرآن میں کوئی ردوبدل کر سکوں۔ میرا منصب یہ ہے کہ میں اس کا اتباع کروں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ اور کسی چیز کا اتباع نہ کروں۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک سخت مصیبت کے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ یہ بات کسی ضد کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس لئے تھی کہ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ۔ (۲۳/۷۱) اگر حق لوگوں کے خیالات اور خواہشات کے پیچھے چلنے لگ جائے تو ارض و سموٰت اور جو کچھ اس کے اندر ہے درہم برہم ہو جائے۔ لہٰذا حق کی باطل کے ساتھ مفاہمت ہو نہیں سکتی۔ البتہ ان سے ایک بات کہی جا سکتی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جس روش پر یہ چل رہے ہیں وہ خوشگوار پھلوں اور کامیابیوں کی روش ہے۔ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ روش تباہیوں اور بربادیوں کی طرف لے جانے والی ہے۔ زندگی کی کامرانیوں کا ضامن وہ پروگرام ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو۔ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عَامِلُوْنَ۔ وَانْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ۔ (۱۱/۱۲۱) ان لوگوں سے جو تمہاری بات کا یقین نہیں کرتے یہ کہہ دو کہ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو۔ اور ہمیں اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ اس کے بعد تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ نتائج خود بتائیں گے کہ حق و صداقت کی راہ کون سی ہے؟

اس کے ساتھ ان سے یہ بھی کہو کہ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ۔ میں تم سے صرف ایک بات

کی نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَفُرَادٰی۔ اور وہ یہ ہے کہ تم زیادہ نہیں تو ایک ایک، دو دو کر کے اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ ثُمَّ تَتَفَکَّرُوْا۔ اور اپنے جذبات سے الگ ہٹ کر جن میں تم اس وقت اندھا دھند بہے چلے جا رہے ہو، سوچو۔ غور و فکر کرو۔ اگر تم نے خالی الذہن ہو کر سوچنے کی کوشش کی تو تم خود بخود اس نتیجہ پر

سوچو

پہنچ جاؤ گے کہ مَا بِصَاحِبِکُمْ مِّنْ جِنَّۃٍ۔ (۳۴/۴۶)۔ تمہارا یہ ساتھی پاگل نہیں ہے یہ جو کچھ کہتا ہے بڑی سمجھ بوجھ کی بات کہتا ہے۔ اس کے ماننے میں تمہارا ہی بھلا ہے۔ مَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ۔ (۲۵/۵۷) میں تو تم سے اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگتا۔

اس سے بہت سے سعادت مند افراد نے، رفتہ رفتہ اِدھر آنا شروع کر دیا۔ اور اس جماعت میں ترقی ہونی شروع ہو گئی۔ ان کے سامنے بہت بڑا پروگرام تھا۔ غلط معاشرہ کی جگہ ایک جدید معاشرہ کا قیام، جس میں مفاد پرستوں کی ہوس رانیوں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو۔ کوئی چھوٹا کام نہ تھا۔ قدوسیوں کا یہ مختصر سا گروہ دن رات اسی فکر میں غلطاں و پیچاں اور اسی مقصد کے حصول کیلئے جنباں و کوشاں رہتا تھا۔ اس باب میں اس کی شدتِ شوق خود فراموشی تک پہنچ جاتی تھی۔

دن رات کا پروگرام

جسے روکنے کے لئے خود دستِ قدرت کو اس قافلۂ رشد و ہدایت کے ہدی خواں کی دامن کشی یہ کہہ کر کرنی پڑی تھی کہ یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَہٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا۔ (۷۳/۱-۳) راتوں کو تھوڑا جاگا کرو۔ نصف شب تک یا اس سے کم و بیش۔ اس لئے کہ ابھی تو آغازِ سفر ہے۔ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (۷۳/۵) تجھ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈالی جانے والی ہے۔ اور اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا (۷۳/۷) تجھے دن کو کون سا آرام کا وقت مل جاتا ہے۔ اس میں بھی تمہارا پروگرام لمبا چوڑا ہوتا ہے۔

جوں جوں یہ پروگرام قرار گیر ہوتا جا رہا تھا، مخالفین کی ایذا رسانیاں شدید تر ہوتی جا رہی تھیں۔ عام لوگوں کو مخالفین پر غصہ آتا ہے اور ان کے خلاف آتشِ انتقام تیز ہوتی جاتی ہے۔ لیکن نبی کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جس طرح ایک طبیب مشفق کو نادان مریض کی بے احتیاطی اور بد پرہیزی سے دکھ ہوتا ہے۔ اسی طرح ان مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی پر نبی اکرمؐ کا جی کڑھتا تھا۔ اور اس تصور سے آپ کا دل خون ہو جاتا تھا اسی طرح ان مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی پر نبی اکرمؐ کا جی کڑھتا تھا۔ اور اس تصور سے آپ کا دل خون ہو جاتا تھا کہ یہ نادان محض تعصب اور جہالت کی وجہ سے کس طرح اپنے آپ کو تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت احساس

مخالفین سے ہمدردی

کی یہ کیفیت تھی کہ خود اللہ تعالیٰ کو یہ کہنا پڑا کہ لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۲۶/۳) ایسا نظر آتا ہے کہ تم اس غم میں

کہ یہ لوگ حق و صداقت کی راہ کو تسلیم نہیں کرتے، اپنی جان ہلاک کر لو گے۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ۔ (۳۵/۸) ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کی حالت پر غم کھانے سے تم اپنی جان گنوا بیٹھو۔ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا۔ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ۔ (۴۲/۴۸) اگر یہ لوگ اس راہ سے اعراض برتتے ہیں تو ہم نے تجھے ان کا محافظ بنا کر نہیں بھیجا۔ تمہارے ذمہ بس اتنا ہی ہے کہ تم اس پیغام کو ان تک پہنچا دو۔ ہم نے انہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور اپنا راستہ آپ اختیار کرنے کی استعداد بخشی ہے۔ ماننا نہ ماننا ان کا اپنا کام ہے۔ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ۔ (۸۸/۲۱-۲۲) تم انہیں حقیقت کی یاد دہانی کراتے رہو۔ تمہارا فریضہ یاد دہانی کرانا ہے۔ تم ان پر داروغہ نہیں مقرر کئے گئے۔

یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ وہ وقت آ پہنچا۔ جب دیکھ لیا گیا کہ ان میں سے جن لوگوں نے عقل و فکر اور دلیل و برہان کی رُو سے صحیح راستہ اختیار کرنا تھا وہ اس جماعت میں شامل ہو گئے اور باقی وہ رہ گئے ہیں جن پر پند و نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۶) انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے ان کے لئے یکساں ہے۔

اعراض

جو شخص خودکشی کرنے پر تُلا بیٹھا ہو، اس سے یہ کہنا کہ دیکھنا کہ راستے میں کھائی ہے، بے کار ہے، جو شخص حیوانی سطح زندگی (PHYSICAL LIFE) ہی کو زندگی سمجھتا ہے اور انسانی زندگی کو تسلیم نہیں کرتا اور باوجود ہر طرح سمجھانے کے لئے اپنی ضد نہیں چھوڑتا۔ اسے انسانی سطح زندگی کے اصول و قوانین کی تلقین کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ لہٰذا اس مقام پر حضورؐ سے کہا گیا کہ فَأَعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا۔ (۵۳/۲۹) "سو جو شخص ہمارے قوانین سے رُوگردانی کرتا ہے اور طبیعی زندگی کے علاوہ اور کچھ ارادہ ہی نہیں رکھتا اس سے تم اعراض برتو۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ۔ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ۔ (۴۳/۸۹) ان سے الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ میرا اب سلام ہے عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ تم کہتے تھے وہ کس طرح حرفاً حرفاً ٹھیک تھا۔

لیکن ان مخالفین کا جوشِ انتقام اس کے باوجود ٹھنڈا نہ ہوا اور وہ حضورؐ کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرنے لگے۔ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ۔ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ (۸/۳۰) (اور اے رسول! وہ وقت یاد کرو جب) مخالفین تیرے خلاف اپنی خفیہ تدبیروں میں لگے ہوئے تھے تاکہ تجھے گرفتار کر لیں یا قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے تھے۔ اور خدا اپنی تدبیر کر رہا تھا۔ اور (یہ ظاہر ہے کہ) خدا بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

حضورؐ کیخلاف سازشیں

ہجرت

چنانچہ اسی تدبیر کے مطابق حضورؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی جہاں کی فضا کے متعلق علم تھا کہ وہ نظامِ خداوندی کی تشکیل کے لئے زیادہ سازگار ہے۔ ہجرت سے یہی مقصود ہوتا ہے۔ اسی لئے مکہ چھوڑتے وقت حضورؐ کے لب پر یہ دعائیں تھیں کہ (وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا (۱۷/۸۰) اے میرے نشوونما دینے والے! مجھے جہاں کہیں پہنچا سچائی کے ساتھ پہنچا۔ اور جہاں سے نکال سچائی کے ساتھ نکال اور مجھے اپنے ہاں سے ایسی قوت عطا فرما جو ہر حال میں مدد کرنے والی ہو۔

آپؐ اس حالت میں مکہ سے نکلے کہ صرف ایک رفیق ہمراہ تھا۔ لیکن اس (بظاہر) بیکسی اور بے لبسی کے عالم میں بھی اپنے مشن کی صداقت اور کامیابی پر ایسا یقین محکم تھا کہ اپنے ساتھی کو تلقین فرما رہے تھے کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ (۹/۴۰) مت گھبراؤ۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

مدینہ کے مسلمانوں نے، مکہ سے آنے والے مسلمانوں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اور یوں ایک ایسی برادری کا وجود عمل میں آیا جو خون، رنگ، وطن کی نسبتوں سے بلند ہو کر محض آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر متشکل ہوئی تھی اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تصدیق ہوئی کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْا اُوْلٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (۸/۷۲) جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی۔ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) جگہ دی۔ اور ان کی مدد کی۔ تو یہی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔

اب (بنظر بظاہر) مخالفین کی مخالفت ختم ہو جانی چاہیئے تھی لیکن انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ نظام جس کی طرف نبی اکرمؐ دعوت دیتے تھے، کسی ایک مقام میں بھی متشکل ہو گیا تو اس کے حیات بخش نتائج کو دیکھ کر دوسرے مقامات کے لوگ اس کی طرف لپک کر بڑھیں گے اور یوں ان کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے اس جماعت کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اور لڑائی کے لئے اُمنڈ آئے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ان کا مقابلہ میدانِ جنگ میں کیا جائے۔ چنانچہ اس مختصر سی جماعت کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ۔ ان مظلوموں کو (جنگ کی) اجازت دی جاتی ہے۔ جن کے خلاف جنگ کرنے کے لئے دشمن اُمنڈ آئے ہیں۔ اللہ یقیناً ان کی مدد پر

جنگ کی اجازت

قادر ہے۔ اِنِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے

گئے۔ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے انہیں جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔ اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے کہ (جو لوگ دوسروں پر زیادتی کرنے کی غرض سے چڑھ دوڑتے ہیں) ان کی مدافعت دوسرے انسان کریں تو اس دھاندلی کا نتیجہ یہ ہو کہ دنیا میں مذہب کی آزادی ختم ہو جائے اور نہ راہبوں کی کوٹھڑیاں باقی رہیں نہ عیسائیوں کے گرجے۔ نہ یہودیوں کے معبد سلامت رہیں نہ مسجدیں جن میں خدا کا ذکر اس کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ ہے خدا کا پروگرام وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ سو جو شخص اس پروگرام کی تکمیل میں خدا کی مدد کرے گا۔ خدا اس کی ضرور مدد کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا طاقتور اور غالب ہے۔ اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ مظلوم جنہیں جنگ کی اجازت دی گئی ہے اگر غالب آ گئے اور انہوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تو ان کی حکومت دوسرے اربابِ اقتدار سے کس طرح مختلف ہو گی۔ فرمایا کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱-۳۹) وہ لوگ ہیں جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہو گا تو یہ نظام صلوٰۃ کو قائم کریں گے۔ نوعِ انسان کی پرورش کا انتظام کریں گے۔ لوگوں کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا حکم دیں گے اور غیر خداوندی قوانین کی اطاعت سے روکیں گے۔ غرضیکہ اس میں تمام امور آخر الامر خدا کے پروگرام کے مطابق طے پائیں گے۔

اسلامی مملکت کا مقصد

اس مقصد کے لئے انہیں جنگ کی اجازت دی گئی۔ دونوں جماعتوں کا آمنا سامنا بدر کے مقام پر ہوا (۳/۱۲۳) مسلمانوں کے لشکر کی کمان خود نبی اکرمؐ کر رہے تھے۔ مخالفین کو شکست ہوئی اور مظلومین کی یہ جماعت جو ابھی تھوڑا ہی عرصہ پہلے اپنے گھروں سے نکالی گئی تھی۔ فاتح و منصور واپس لوٹی۔

شکست خوردہ مخالفین نے اپنی ذلت و رسوائی کا بدلہ ان بے گناہ مسلمانوں سے لینا شروع کر دیا جو مکہ میں رہ گئے تھے اور ہجرت کر کے مدینہ نہیں آ لے پائے تھے۔ یہ مظلوم اپنی مدد کیلئے مسلمانوں کے علاوہ اور کسے پکار سکتے تھے۔ ان کی مدد ان پر لازم تھی۔ اور اگر اس کے لئے جنگ ناگزیر ہو جائے تو جنگ بھی کی جا سکتی تھی۔ یعنی ظلم کی روک تھام کے لئے جنگ خواہ وہ ظلم کہیں ہو رہا ہو۔ اس لئے کہا گیا کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (۴/۷۵) (مسلمانو!) تمہیں کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں

مظلوموں کی امداد

جنگ نہ کرو۔ ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے جو (چیخ چیخ کر) پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نجات دلا جس کے رہنے والے اس قدر ظالم ہیں۔ اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی پشت پناہ بنا اور اپنے حضور سے ہمارا کوئی مددگار بھیج۔

فرائضِ رسالت

لڑائیوں کا یہ سلسلہ سات آٹھ سال تک مسلسل رہا تاآنکہ (آخرالامر) مکہ فتح ہوگیا اور یوں ہر طرف دینِ خداوندی غالب آگیا۔ اس دوران میں آپ اس نظامِ نو کی تشکیل اور اس کے مختلف گوشوں کی تعمیر و تحسین کے لئے مسلسل کوشاں رہے اس پروگرام کی متعدد شقیں تھیں، مثلاً

(۱) سب سے پہلی شق یہ ہے کہ جو کچھ آپ پر خدا کی طرف سے نازل ہوا اُسے دوسروں تک پہنچا یا جائے۔ اس کے لئے ارشادِ خداوندی تھا کہ یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔ (۵/۶۷) اے رسول! جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دے۔

(۲) لوگوں کو قوانین اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دینا اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲/۲) یہ رسول لوگوں کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کرتا ہے ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتا ہے۔ انہیں قوانین الٰہیہ اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے۔

(۳) خود قرآن کریم کا اتباع کرنا (۶/۱۵۵) اور اپنی جماعت کو حکم دینا کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳) جو کچھ اللہ نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اور اس کے علاوہ دوسرے کارسازوں کا اتباع مت کرو۔

(۴) لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کرنا۔ اس کے لئے ارشادِ خداوندی تھا فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔۔۔ (۵/۴۹) جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق ان میں فیصلے کرو۔ اس لئے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جو خدا نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

(۵) امورِ مملکت کے فیصلے اپنی جماعت کے مشورے کے ساتھ سرانجام دینا۔ اس لئے حکمِ خداوندی تھا۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳/۱۵۸) اے رسول! تو معاملات میں اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کیا کر اور جب اس کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو پھر قانونِ خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کر کے معاملہ پیشِ نظر کی سرانجام دہی کے لئے عمل پیرا ہو جا۔ اس جماعت کی اہمیت اور قدر و منزلت کو خدائے بزرگ و برتر نے ان وجد آفریں الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

جماعتِ مومنین

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۖۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۔ (۴۸/۲۹)

محمدؐ اللہ کے رسول اور ان کے ساتھ (قدوسیوں کی جماعت) جن کی خصوصیت یہ ہے کہ حق وصداقت سے انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت لیکن باہمدگر سرتاپا رافت ومحبت ہیں۔ وہ دنیا میں کسی طاغوتی طاقت کے سامنے نہیں جھکتے۔ جھکتے ہیں تو فقط ایک اللہ کے سامنے۔ اسی سے وہ فضل وعنایات کے خواہاں اور اسی کی رضاجوئی کے طالب۔ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے سے ان کے دل میں اطمینان وسکون اور شادابی وشگفتگی کی جو جنت پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات ان کے چہرے سے نمایاں ہیں۔ یہی ہے قدوسیوں کی وہ جماعت جس کے تذکرے تورات وانجیل میں ہیں۔ یہ جماعت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ حق وصداقت کی لہلہاتی کھیتی ہے شروع میں اس کی کیفیت یہ تھی کہ ایمان کی زمینِ صالح سے اعمال کا تخمِ حسنہ نرم ونازک پتی کی شکل میں نمودار ہوا۔ پھر اس میں تقویت پیدا ہوئی تو وہ ایک شاخِ نودمیدہ کی صورت اختیار کر گیا۔ پھر اس میں اور توانائی پیدا ہوئی تو وہ دیکھو وہ ایک سرسبز وشاداب کھیتی بن گیا جسے دیکھ کر کسان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور حاسدوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ یہ تھے حفاظت اور اجرِ عظیم کے وہ درخشندہ وعدے جو اللہ نے ایمان و اعمالِ صالحہ کے بدلے میں اس جماعت کے ساتھ کئے تھے۔ اور جنہیں اس کی شانِ ربوبیت نے اس حسن ورعنائی سے پورا کیا۔ ذرا جماعتِ مومنین کی اس خصوصیتِ کبریٰ پر ایک بار پھر نگاہ ڈالئے کہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم

اقبالؒ کے الفاظ میں۔ ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر وپرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تندرو کوہ وبیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

حضورؐ کو اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کرتے کا جو حکم دیا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان امور میں خدا کی طرف سے وحی نہیں آتی تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جو امور وحی کی رُو سے طے پا جائیں ان میں انسانوں

سے مشورہ کے کیا معنی؟ یہ امور وحی کے قوانین کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق عقل و فکر کی رُو سے طے کئے جاتے تھے۔ جس میں غلطی کا امکان بھی تھا۔ اس کے لئے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَا اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْ اِلَیَّ رَبِّیْ۔ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ (۳۴/۵۰) ان سے کہہ دو کہ میں اگر کبھی غلطی کر جاتا ہوں تو وہ غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور جب میں صحیح راستہ پر ہوتا ہوں تو وہ اس وحی کی بناء پر جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے۔ وہ سب کچھ سننے والا اور ہر ایک کے قریب ہے۔ جو کچھ وحی کی رُو سے طے ہوتا تھا اس میں نہ رسول اللہ کو کسی قسم کا اختیار ہوتا تھا اور نہ جماعتِ مومنین کو۔ لیکن جو امور ذاتی رائے پر چھوڑ دیئے جاتے تھے ان میں لوگوں کو ایسی آزادیٔ رائے اور حریتِ فکر و عمل حاصل تھی جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اسی آزادیٔ فکر و آراء کا نتیجہ تھا کہ ایک عام عورت تک اپنے معاملہ میں حضورؐ کے ساتھ پوری جرأت کے ساتھ جھگڑ سکتی تھی۔ ایسی جرأت جس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر دی کہ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ۔ (۵۸/۱) اللہ نے اس عورت کی بات کو سن لیا جو تجھ سے (اے رسولؐ) اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑتی تھی اور اللہ کے حضور شکایت کرتی تھی۔ وہ تم دونوں کی گفتگو کو سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور جب آپؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے زید سے کہا کہ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷) اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ، اسے طلاق مت دے۔ تو انہوں نے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور بیوی کو طلاق دے دی۔ اس سے نہ مشورہ دینے والے کے دل میں کوئی ملال پیدا ہوا نہ مشورہ سے انکار کر دینے والے کے دل میں کسی قسم کا خیال۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کا مشن ہی یہ تھا کہ نوعِ انسان کو قوانین خداوندی کی اطاعت کے علاوہ ہر قسم کی غلامی اور محکومی سے نجات دلائی جائے۔ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷) اس رسول کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ یہ انسانوں کے سر سے وہ بوجھ اتار دے جس میں وہ دبے ہوئے ہیں۔ اور انہیں ان زنجیروں سے آزاد کرا دے جن میں وہ جکڑے چلے آ رہے ہیں۔ تیئیس سال کی اس جدوجہد سے آپ نے وہ فضا پیدا کر دی جس میں ہر انسان پوری طرح آزادی کا سانس لے رہا تھا اور علیٰ وجہ البصیرت محسوس کرتا تھا کہ وہ سوائے قوانین خداوندی کے کسی کا محکوم اور غلام نہیں۔ اس طرح یہ حقیقت ہر ایک کے سامنے ابھر کر آ گئی کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے کتاب اور

غلطی کا امکان

آزادیٔ فکر

حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے محکوم بن جاؤ۔ (اسے یہی کہنا چاہیئے کہ) تم اس کتاب خداوندی کی رو سے جس کی تم تعلیم دیتے ہو اور جس کے مطالب کو تم اپنے دلوں پر نقش کرتے ہو، اپنے رب کے بندے بن جاؤ۔ اسی حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے آپؐ بار بار اس کا اعلان فرماتے تھے کہ (قُلْ) اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ — (۱۸/۱۱۰)

بشریت

میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں فرق یہ ہے کہ میری طرف خدا کی جانب سے وحی آتی ہے۔ اور میں خود اس وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ (۶/۵۰)۔

اس طرح رفتہ رفتہ دین کی تکمیل ہو گئی۔ اور خدا نے اعلان کر دیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۶) اور تیرے رب کی باتیں صدق و عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئیں۔ اب انہیں کوئی بدلنے والا نہیں۔ اور وہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔ خدا کی یہ باتیں جو اس نے نوع انسان کی ہدایت کے لئے دینی تھیں۔ قرآن کریم میں جمع ہو گئیں۔ جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ (۱۵/۹) یقیناً ہم نے اس ضابطہ قوانین کو نازل کیا ہے اور ہمیں اس کے محافظ ہیں۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا کہ قانونِ فطرت کے مطابق آپ کی حیاتِ طبیعی بھی ایک دن ختم ہو جانے والی ہے، اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۔ (۳۹/۳۰) اور جماعتِ مومنین سے کہہ دیا کہ حضورؐ کی وفات سے اس نظام میں قطعاً کوئی فرق نہیں آ سکتا جسے آپ نے وحیٔ خداوندی کی روشنی میں متشکل فرمایا ہے۔ یاد رکھو وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔ محمدؐ بجز این نیست کہ خدا کے ایک پیغامبر ہیں۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ آپ سے پہلے بھی خدا کے کئی رسول آئے اور گزر گئے۔ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۔ سو اگر وہ مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سلسلہ صرف آپ کی ذات تک محدود تھا) اپنے پچھلے نظام کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۔ (۳/۱۴۳) جو تم میں سے الٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرے گا۔ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

حضورؐ کے بعد

رسول کا فریضہ یہ تھا کہ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ (۷/۱۵۷) وہ لوگوں کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جنہیں قرآن نے صحیح تسلیم کیا ہے اور ان سے روکتا ہے جنہیں قرآن نے ناپسندیدہ ٹھہرایا ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد یہی فریضہ تمہارا ہوگا کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ (۳/۱۰۹) تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوع انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ

لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انہیں منکر سے روکو۔ یہ معروف و منکر اس کتاب کے اندر ہے جس کا تمہیں وارث بنایا جا رہا ہے ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ...(۳۵/۳۲) لیکن اس کے لئے ایک بنیادی شرط ہے اور وہ یہ کہ تمہارے رسولؐ نے یہ کچھ اس لئے کر کے دکھا دیا تھا کہ وہ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز تھا۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ (۶۸/۴)

علیٰ خلق عظیم

اس لئے تمہیں بھی بلند ترین اخلاق کا حامل ہونا ہوگا۔ اس باب میں رسولؐ کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (۳۳/۲۱) اس کا (TEST) اور معیار یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ بھرے مجمع میں مخالفین سے کہتے تھے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶) میں نے تمہارے اندر اس سے پہلے اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں! اسی طرح تم میں سے بھی جو کوئی اپنے مخالفین کے سامنے سینہ تان کر اس کا دعویٰ کر سکے گا۔ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ۔ وہی رسول اللہؐ کے نقش قدم پر چلنے والا ہوگا اور اسی قسم کے لوگوں کے ہاتھوں یہ نظام آگے بڑھے گا۔ نبی اکرمؐ کے خُلقِ عظیم کا اعتراف صرف آپؐ کے مخاطبین ہی نے نہیں کیا۔ دنیا کے بڑے بڑے مورخین اور مفکرین اس باب میں رطب اللسان ہیں اور (LAMARTINE) کے الفاظ میں بآواز بلند کہتے ہیں کہ

> ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت و بلندی کو ماپا اور پرکھا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد ہمارے اس سوال کا جواب دو کہ — کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان بھی کوئی پیدا ہوا ہے؟
>
> (معراج انسانیت صـ ۸۳۲)

یہ ہیں نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے وہ نمایاں خط و خال جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس زریں داستان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے لیکن ہم نے اس مقام پر اختصار سے کام لیا ہے۔ یہی حضورؐ کی وہ سیرتِ مقدسہ ہے جس کے حرفاً حرفاً سچا ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۔ (۲/۲) باقی رہے تاریخی واقعات۔ سو ظاہر ہے کہ ان میں وہی سچے قرار پا سکتے ہیں جو حضورؐ کی سیرتِ قرآنیہ کے مطابق ہوں۔ یہی وہ حسین سیرت اور رعنائی کردار ہے جس کے پیش نظر، خدا اور اس کے فرشتے اس ذاتِ گرامی پر تبریک و تہنیت کے پھول برساتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (۳۳/۵۶)

صرف حضورؐ پر ہی نہیں بلکہ اس جماعت مومنین پر بھی جو حضورؐ کے اتباع میں نظامِ خداوندی کے قیام کا باعث بنتی ہے۔ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۔ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۳۳/۴۳)

حقائق و عبر

۱۔ تحریکِ پاکستان میں شامل ہونے سے ذہن پراگندہ ہو جاتے۔

مؤقر روزنامہ نوائے وقت لاہور کی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں جماعتِ اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے "ہم نے تحریکِ پاکستان میں حصّہ کیوں نہیں لیا تھا"۔ اس میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ انہوں نے جماعتِ اسلامی کی تشکیل و تنظیم کو قیامِ پاکستان کے کام سے مقدم سمجھا، پھر فرماتے ہیں:۔

البتہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ کام شروع کرنے کے بعد بھی تو تحریکِ پاکستان میں حصّہ لیا جا سکتا تھا۔ پھر ایسا کیوں نہ کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کی زمین میں اسلام کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کے لئے جو جماعت قائم کی گئی ہو اس کی تنظیم اور ذہنی و اخلاقی ترتیب ایک بالکل جداگانہ نوعیت کا کام تھا جو ایک طوفان خیز عوامی تحریک کے ساتھ چلتے ہوئے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر آغاز ہی میں ہم ایسی کسی تحریک میں شامل ہو جاتے تو ہمارے لئے کسی طرح یہ ممکن نہ ہوتا کہ اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ذہن کو پراگندہ اور ان کے اخلاق کو عوامی سطح تک گر جانے اور تنظیم کے بجائے بدنظمی میں مبتلا ہونے سے بچا سکتے۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۲ ستمبر ۱۹۸۶ء صـ۳ کالم ۶)

طلوعِ اسلام | مودودی صاحب کے اپنے ان چند الفاظ سے پاکستان کے بارے میں، ان کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے، تحریکِ پاکستان میں شامل ہونے سے جماعتِ اسلامی والوں کے ذہن پراگندہ ہونے کا خطرہ تھا!

۲۔ نظریہ پاکستان کے نئے اجارہ دار!

نظریۂ پاکستان کے حوالے سے، جماعتِ اسلامی والے قیامِ پاکستان کے سلسلے میں اپنی

جن خدمات کا ذکر کرتے رہتے ہیں، اس کی تردید کرتے ہوئے روزنامہ نوائے وقت اپنی ۲۴ ستمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ جماعتِ اسلامی والوں پر یہ واضح ہو جانا چاہیئے کہ قیامِ پاکستان کا سہرا سوائے علامہ اقبالؒ اور حضرت قائداعظمؒ کے کسی کے سر نہیں سجتا۔ پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے، اس نے جماعتِ اسلامی والوں کو یہ تلقین کی ہے :۔

اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی فکر کو آگے بڑھانے اور اس کی تشریح و توضیح کا کام جاری رہنا چاہیئے تھا، لیکن قائداعظمؒ کی بے وقت موت کے بعد مسلم لیگ کی سیاسی قیادت یہ فریضہ بوجوہ انجام نہ دے سکی اور خانہ خالی را دیواں می گیرند کے مصداق نظریہ پاکستان کے تحفظ کی ذمہ داری زبردستی دوسروں نے اپنے ذمہ لے لی، اگرچہ بجائے خود یہ کام بُرا نہیں تھا لیکن نئے اجارہ داروں نے اپنے علاوہ باقی پاکستانیوں کو سچا مسلمان سمجھنا ہی چھوڑ دیا اور ان کے لئے بطورِ خاص "پیدائشی مسلمان" کی اصطلاح گھڑ لی گئی۔ ہم کسی پر ان حوالوں سے نکتہ چینی کر کے بدگمانیاں پیدا کرنا نہیں چاہتے بلکہ محض یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ صرف اور صرف اپنے آپ کو اسلام کا داعی یا نفاذِ اسلام کا خواہاں قرار دینے سے جو لوگ پہلے بھی مجموعی قومی دھارے سے کٹے رہے ہیں اور آئندہ بھی یہ پالیسی ان کے لئے سود مند نتائج کی حامل نہیں ہو سکتی، انہیں اپنی انا کے دائرے سے باہر نکلنا چاہیئے اور اسلام یا دینی موضوعات پر گفتگو کا حق دوسروں کو بھی دینا چاہیئے۔

۳۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا اپنے غلط فتویٰ پر اصرار :

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سعودی عرب کے دورے پر تشریف لے گئے تھے تو وہاں پر مقیم پاکستانیوں نے، غیر اہل کتاب یعنی ہندوؤں اور سکھوں وغیرہ کے ساتھ کھانے پینے کے بارے میں ان سے دریافت کیا تو ڈاکٹر صاحب نے یہ فتویٰ دیا :۔

سعودی عرب میں تارکینِ وطن کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ انہیں کیمپوں میں ہندوؤں کے ساتھ یا ہندو باورچیوں کا تیار کردہ کھانا برداشت کرنا پڑتا ہے، جس پر متعدد بار پاکستانیوں کو ناگوار حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ غیر اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے کی ممانعت ہے، اس لئے مسلمانوں کو احتیاط کرنی چاہیئے ..... الخ

(ماہنامہ "میثاق" لاہور صفحہ ۱۰ ج ۳۵ عدد شمارہ ۲)

(بحوالہ ماہنامہ البلاغ بابت ستمبر ۱۹۸۶ء صہ ۳۸)

اس کے مقابلے میں علمائے دیوبند اور سعودی عرب کے علماء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ ماہنامہ البلاغ کے مطابق ڈاکٹر صاحب کی توجہ ان کے غلط فتویٰ کی طرف دلائی گئی تو انہوں نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا چنانچہ ان کی غلطی واضح کرنے کے لئے، البلاغ کی ستمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں ایک مفصل

مضمون شائع کیا گیا ہے۔ جس میں قرآن، حدیث اور فقہ کے حوالے سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ کھانے پینے کی شرعاً کوئی ممانعت نہیں۔ بشرطیکہ کھانے پینے والی اشیاء حلال ہوں۔ مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فتویٰ کی وجہ سے سعودی عرب میں اکثر مقامات پر پاکستانی عوام اور اہل علم حضرات کے مابین یہ مسئلہ انتہائی نزاعی صورت اختیار کر گیا ہے۔

طلوع اسلام ہم اس کے بارے میں اس کے سوا کیا عرض کر سکتے ہیں کہ نیم حکیم خطرہ جان، نیم ملا خطرہ ایمان۔ ہم کئی دفعہ عرض کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب قرآن حکیم کے بارے میں بھی محض سنی سنائی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں اب علمائے دیوبند کے اس ترجمان سے معلوم ہوا کہ حدیث اور فقہ کی بابت بھی ان کا علم محض سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ بہشتیوں کا استقبال

پنجاب کے ایک شہر پاکپتن کی ایک درگاہ کے دروازے کو بہشتی دروازہ کہا جاتا ہے، جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اس دروازے کے آگے سے گزرنے والا بہشت میں جائے گا۔ جو لوگ اس سال اس دروازے کے آگے سے گزرے اور ان کا جس طرح استقبال کیا گیا، ہفت روزہ الاسلام لاہور نے اس کی تفصیلات ان لفظوں میں بیان کی ہے:۔

بہشتی دروازہ سے گزرنے والے زائرین پر شدید لاٹھی چارج، سینکڑوں زخمی، مشتعل افراد کی فائرنگ سے چار رضاکار بھی زخمی، بہشتی دروازہ دو گھنٹہ قبل ہی بند کر دیا گیا۔ آج تیسری رات بہشتی دروازہ کمشنر ملتان ڈویژن سید سرفراز حسین نے کھولا۔ اس وقت ان کے ہمراہ ڈویژنل اور ضلعی حکام تھے گزشتہ رات ایک لاکھ کے قریب افراد بہشتی دروازہ سے گزرے دوسری رات لاٹھی چارج میں قومی رضاکار پولیس سے بھی سبقت لے گئے اور رضاکاروں کے لاٹھی چارج سے سینکڑوں زائرین لہولہان اور بیہوش ہو گئے۔ گزشتہ رات بہشتی دروازہ سے گزرنے کے دوران ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ کچہری دیوان صاحب کی بالائی منزل سے بعض نامعلوم افراد نے بہشتی دروازہ سے گزرنے والوں پر رضاکاروں کا تشدد دیکھ کر فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجہ میں چار رضاکار زخمی ہو گئے اسی بنا پر دو گھنٹے قبل ہی بہشتی دروازہ بند کر دیا گیا۔"

یہ کیسی بہشت کا دروازہ ہے جس میں سے گزرنے کیلئے ہی بدنام زمانہ شعبہ کی لاٹھیاں اور گالیاں کھانی پڑتی ہیں؟ جس میں سے گزرنے کے لئے جیبوں کا صفایا کروانا پڑتا ہے؟ جس میں سے گزرنے کے لئے صبح اور بعض اوقات پچھلے دن سے ہی قطار میں کھڑے ہو کر تھکاوٹ، پریشانی، اضطراب اور دکھ درد برداشت کرنے پڑتے ہیں؟ جس کے محافظ اور کھولنے والے اس محکمے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں "اندھیرا اجالا" برابر ہے؟ جس کے دربانوں پہ فائرنگ بھی ہوتی ہے؟

۵۔ مجوزہ شریعت بل کے بارے جمعیتِ اہلحدیث کا موقف!

علماء کی جانب سے پیش کیا جانے والا مجوزہ شریعت بل جس پر ان دنوں سینٹ میں بحث ہو رہی ہے، اس پر غور کرنے کے لیئے جمعیتِ اہلحدیث کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس ہوا جس نے اس بل کو مسترد کرتے ہوئے اپنی متفقہ رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

جمعیت اہلحدیث پاکستان کی رائے میں مجوزہ شریعت کے بارے میں جس قدر پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اسے نفاذِ شریعت کے لئے سنگِ میل قرار دیا جا رہا ہے۔ اور اس کے نفاذ اور عدم نفاذ کو جس طرح کفر و اسلام کی جنگ قرار دیا جا رہا ہے، واقعاتی اور حقیقی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی اہمیت اور حیثیت نہیں ہے۔ کیونکہ جس حکمران طبقے نے شرعی حدود کو آرڈیننس کے ذریعے نافذ کرنے کے باوجود اور اسے قانون کی شکل دینے کے باوصف نہ صرف اسے نافذ نہیں کیا بلکہ ان کا تمسخر اڑایا اور انہیں ایک مذاق بنا کر رکھ دیا ہے، اس طبقے سے کسی صورت یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ مجوزہ شریعت بل جسے صرف ایک تجویز کی حیثیت حاصل ہے، اس کے پاس ہونے سے بنیادی تبدیلی رونما ہو جائے گی۔

۶۔ مجوزہ شریعت بل کی تائید برداشت نہیں

ہمارے ملک میں فرقۂ اہل حدیث بھی عجیب لوگوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے دو گروپ ہیں، ایک صاحب اقتدار لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور دوسرا اپوزیشن کے راگ الاپتا ہے اور لطف کی بات ہے کہ دونوں گروپ اس سلسلے میں احادیث نبوی کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کے ایک گروپ کے آدمی اس گروپ سے ٹوٹ کر جب دوسرے گروپ میں جا ملتے ہیں تو اپنے پہلے گروپ پر عجیب عجیب الزامات لگاتے ہیں۔ حال ہی میں اوّل الذکر گروپ کے ناظم نشر و اشاعت اپنے گروپ سے ٹوٹ کر دوسرے گروپ میں جا ملے ہیں، اس علیحدگی کا سبب انہوں نے یہ بتایا ہے کہ وہ مجوزہ شریعت بل کی تائید برداشت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق یہ خلافِ اسلام ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے دوسرے گروپ میں شامل ہوتے وقت یہ خط لکھا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گذارش ہے کہ عرصہ دو سال سے میں اپنے رفقاء اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کی قیادت سے مسلسل اختلاف کی وجہ سے تذبذب میں مبتلا رہا۔

مجلس عاملہ اور شوریٰ کے اجلاسوں میں ان سے ان کی پالیسی سے برملا اختلاف کرتا رہا اور ہمیشہ ان کی اپنے دستور سے انحراف، سیاسی غلط پالیسی، جمہوریت کے منافی خیالات پر ان کو ٹوکتا رہا اور شریعت بل کی صورت میں مسلک اہل حدیث کی سبکی اور بے قدری کو محسوس کرتے ہوئے میاں فضل حق اور مولانا معین الدین لکھوی کے گروپ سے کلیۃً علیحدگی اختیار کر رہا ہوں اور خاص طور پر مجوزہ شریعت بل کی تائید کو برداشت کرنے پر تیار نہیں۔

اسی طرح مسلسل دو سال سے آپ کی جمعیت کی علمی، دینی، تبلیغی اور سیاسی سرگرمیوں کا بنظرِ غائر مطالعہ

کرتا رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات نے ملک اور بیرونِ ملک مسلکِ اہلحدیث کے تشخص کو نمایاں کیا ہے اور جماعت کے کاز کو آگے بڑھایا ہے۔ میں حضرت الامیر مولانا محمد عبداللہ اور آپ کی قیادت پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے جمعیت اہلحدیث پاکستان میں شمولیت کا اعلان کرتے ہوئے اپنے دل اور ضمیر میں طمانیت محسوس کرتا ہوں اور آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ اپنی اس پیرانہ سالی میں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا جمعیت اور مسلک کی خاطر کرنے سے گریز نہ کروں گا۔

رَبِّ کائنات آپ کو مسلک کی سربلندی کے لئے خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور مسلکی غیرت و حمیّت کا نشان بنائے رکھے میرے ساتھ میرے دیگر رفقاء اور جماعت ترقی کے خطیب بھی جمعیت میں شمولیت اختیار کر رہے ہیں۔ خدائے ذوالجلال سب کو اپنے راستہ پر قائم اور اس کی طرف بلانے کی ہمت عطا فرمائے رکھے۔

والسّلام

محمد ابراہیم حافظ کمیرپوری۔ (ہفت روزہ الاسلام بابت ۳ اکتوبر ۱۹۸۶ء صفحہ ۸)

۷۔ جماعتِ اسلامی اور واحد اسلامی مملکت:

جماعت اسلامی کے ایک امیر مولانا مسعود عالم ندوی سعودی عرب کے دورے سے واپس آئے تو انہوں نے اپنی کتاب "دیارِ عرب میں چند ماہ" میں سعودی عرب کو غیر اسلامی حکومت قرار دیا، بعد میں مودودی صاحب اس پاک سرزمین پر تشریف لے گئے تو انہوں نے اپنی کتاب سفرنامہ ارض القرآن میں اسے خلافتِ راشدہ کے متماثل قرار دے دیا۔ اور جماعتِ اسلامی والے پچھلے تیس سال تک اسے واحد اسلامی مملکت قرار دیتے رہے۔ لیکن اب انہوں نے اسلامی جمہوریہ ایران کو واحد اسلامی مملکت قرار دے کر سعودی عرب سمیت تمام اسلامی ممالک کو اجتماعی زندگی میں کفر کی پیروی کرنے والے ممالک قرار دے دیا ہے۔ اس کی تفصیلات جماعتِ اسلامی کے ایک لیڈر سید اسعد گیلانی کی زبانی سنیئے۔ جن کے افکارِ عالیہ کو ماہنامہ المسلم کراچی نے اپنی جون ۸۶ء کی اشاعت میں یوں شائع کیا ہے۔

میں اس بات پر فخر محسوس کر رہا ہوں کہ اسلام کے نظام کی نمائندگی کرنے کے لئے کم از کم ایک مملکت (اسلامی جمہوریہ ایران) تو موجود ہے، جس نے ہم مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے سامنے سرخرو کیا ہے۔

اس وقت دنیا دو طاقتوں کے زیرِ دست منقسم ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت امریکہ کے تابع نظر آتی ہے۔ بظاہر مسلمان ہیں۔ نماز روزہ واجبات ادا کرتے ہیں۔ لیکن اجتماعی زندگی وہ کفر کی پیروی میں بسر کر رہے ہیں۔ ہمارا ملک بھی اس کی ایک مثال ہے۔

کچھ مسلمان ملک ایسے ہیں جو روسی نظام کے تابع نظر آتے ہیں۔ یہ اوّل الذکر نظام سے بھی بدتر ہے۔ مسلمانوں کے لئے باعثِ ننگ ہے کہ وہ کفر کے تابع ہیں۔ اور کفر کو اپنی سلامتی کے لئے قلعہ سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کو ایک عظیم الشان مشن کی تکمیل کے لئے کہا گیا ہے۔ لیکن آج زوال کی حد یہ ہے کہ ہر معاملہ میں کفر کی اطاعت اختیار کر لی گئی ہے ——— لیکن ایرانیوں کا یہ نعرہ کہ "نہ شرقی نہ غربی"، اس سے اسلام سے اندر کا بول بالا ہوا ہے

(اس کا باقی حصّہ صفحہ (۱۶) پر ملاحظہ ہو)

حکیم الامّت علامہ اقبالؒ

قائداعظمؒ، علماء اور مودودی صاحب (مرحوم)

حضرت قائداعظمؒ محمد علی جناحؒ نے اپنی زندگی کا پہلا حصہ نیشنلزم کے مسلک کی تائید اور ترویج کی جدوجہد میں بسر کیا۔ نیشنلزم سے مراد تھی۔ ہندوستان میں بسنے والے تمام باشندوں پر مشتمل (بلا لحاظ مذہب و ملّت) متحدہ قومیت کی تشکیل۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سالہا سال کی کد و کاوش میں ناکامی کے بعد وہ سیاست سے اس قدر بد دل ہوگئے کہ انہوں نے وطن کو خیرباد کہہ دیا اور انگلستان جا کر مقیم ہوگئے۔ یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ ان کا ارادہ مستقل طور پر وہیں سکونت پذیر ہوجانے کا تھا۔ چناں چہ انہوں نے وہاں اپنے لئے ایک مکان بھی خرید لیا تھا۔ اسے حسنِ اتفاق کہئے یا قوم کی خوش بختی کہ علامہ اقبالؒ ۱۹۳۲ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلہ میں لندن تشریف لے گئے تو مسٹر جناحؒ کے ساتھ ان کے روابط قائم ہوئے اور انہیں ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ علامہ اقبالؒ کی نگہِ جوہر شناس اور دور رس نے جلد بھانپ لیا کہ ہندی مسلمانوں کی کشتی جس سیاسی بھنور میں پھنسی ہوئی ہے، اسے وہاں سے جناحؒ کے پتوار ہی نکال سکتے ہیں۔ لیکن (اُس وقت) اِن دونوں کے مقاصد اور مسالک میں جو اختلاف ہی نہیں، جو تضاد اور تصادم تھا وہ واضح تھا۔ لیکن اقبالؒ کی بلند نگہی اور جناحؒ کی کشادہ قلبی نے ایسا انقلابی اثر پیدا کیا کہ جناحؒ، اقبالؒ کا ہمرنگ و ہم نوا ہو کر ۱۹۳۴ء کے اواخر

جناحؒ کی وطن واپسی

(یا ۱۹۳۵ء کے اوائل) میں وطن واپس آگیا۔ اور یہاں سے ان کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس میں قدمِ اوّل، مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کا اثبات تھا۔ اُس وقت ہندوستان کے مسلمان اس قدر مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے کہ ان کی الگ، مستقل قومیت کا تعین تو ایک طرف، انہیں کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا بھی ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن جب قائداعظمؒ نے اس کا عزم کر لیا تو پھر ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا اور اس کے عملی مظاہرہ کا موقعہ بہت جلد آگیا۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت، جداگانہ انتخابات کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ہندی مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ میں بڑا اہم اور نازک مقام تھا۔ اسے ان کی جداگانہ قومیت کا معیار قرار پانا تھا۔ اس کے لئے قائداعظمؒ

نے سنٹرل پارلیمانی الیکشن بورڈ کی تشکیل کی۔ اس بورڈ میں مسلمانوں کی جس قدر مختلف الخیال جماعتوں کے نمائندگان شریک تھے، تاریخ کا طالب علم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ قائداعظمؒ نے اس قدر مختصر سی مدت میں ان متضاد عناصر کو یک جا کس طرح کر لیا تھا؟ (مولانا) ظفر علی خان کی اتحاد ملت پارٹی کے بالمقابل مجلس احرار، جن میں آگ اور پانی کا بیر تھا۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے بالمقابل جمعیت العلماء ہند کے سربرآوردہ نمائندگان مثل مولانا حسین احمد مدنی۔ مفتی کفائت اللہ۔ مولانا احمد سعید۔ اس وقت حالات کس قدر نامساعد تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ۸ جون ۱۹۳۶ء کو ہونے والے "مسلم لیگ کونسل اور پارلیمانی بورڈ کے" اجلاس کس جگہ منعقد ہوں۔ اسلامیہ کالج کا حبیبیہ ہال اس کے لئے موزوں خیال کیا گیا۔ اسلامیہ کالج اس انجمن حمایت اسلام کا تعلیمی ادارہ تھا جس کے استحکام اور فروغ میں علامہ اقبالؒ کے خون جگر کا معتدبہ حصہ تھا۔ علامہؒ نے اس کی اجازت کے لئے، انجمن کے اس زمانہ کے صدر نواب مظفر خان کے پاس اپنا آدمی بھیجا، اور (تاریخ اس سانحہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی کہ) انہوں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اور یہ اجلاس مجبوراً برکت علی محمڈن ہال میں منعقد ہوئے۔[1] قائداعظمؒ کے عزم کو متزلزل کرنے کے لئے یہی دھچکا کچھ کم نہ تھا کہ اس کے بعد دھماکے پر دھماکے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے مولانا ظفر علی خان اور ان کے ساتھی، پارلیمانی بورڈ سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد جمعیت العلماء کی باری آئی۔ یہ حضرات کس بنا پہ الگ ہوئے۔ اس کے متعلق مرزا ابوالحسن اصفہانی نے (جن کا ابھی پچھلے سال انتقال ہوا ہے) اپنی (نہایت پُرعقیدت) کتاب (QAID-E-AZAM, AS I KNEW HIM) میں بڑے تاسف انگیز اور حسرت آمیز انداز میں لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

۱۹۳۷ء کے الیکشن

پارلیمانی الیکشن بورڈ

> پارلیمانی بورڈ کے اجلاس میں بہت سی تقریریں ہوئیں۔ پہلے روز مفتی کفایت اللہؒ و مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی تقریروں میں مسٹر جناحؒ کی حمایت کرتے ہوئے اس بات کا خیر مقدم کیا کہ انہوں نے مسلم لیگ کو زندہ اور فعال سیاسی میدان میں داخل کر دیا ہے لیکن آخری روز انہی میں سے ایک نے تجویز پیش کی کہ چوں کہ لیگ کو کامیاب کرانے کے لئے پراپیگنڈے کی مہم کا بڑی خوش اسلوبی اور سرگرمی سے چلانا ضروری ہے، ہمارا خیال ہے کہ دیوبند کو اس پراپیگنڈے کا مرکز بنا دیا جائے بشرطیکہ اس مہم کا تمام خرچ لیگ برداشت کرے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ پروپیگنڈہ کی اس مہم کا آغاز کرنے کے لئے پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہوگی (صفحہ ۲۳)

---

[1] اقبال کے آخری دو سال (عاشق حسین بٹالوی صفحہ ۳۰۴) لیکن مسٹر جمیل الدین احمد نے کہا ہے کہ یہ اجلاس پہلے میاں عبدالعزیز کے مکان پر اور پھر ریڈیو ہوٹل میں منعقد ہوئے تھے۔ MUSLIM POLITICAL MOVEMENT- MIDDLE PHASE – P.160

اس کے بعد اصفہانی (مرحوم) کہتے ہیں کہ، اس وقت لیگ کے خزانہ میں پچاس ہزار روپیہ تو ایک طرف، پچاس پیسے بھی نہیں تھے۔ اور ان مولانا حضرات کو اس کا بخوبی علم تھا۔ قائداعظمؒ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ اس وقت ہمیں خلوصِ نیت سے کام کا آغاز کر دینا چاہیئے۔ جب قوم میں اس کا احساس پیدا ہوگیا کہ ہمارا موقف حق پر مبنی ہے تو روپے کی کمی نہیں رہے گی۔ لیکن یہ حضرات اس سے مطمئن نہ ہوئے اور مسلم لیگ کو چھوڑ کر کانگریس سے جا ملے۔ اور پھر

پچاس ہزار روپے کے عوض

بقایا ساری عمر اس پروپیگنڈہ کے لئے وقف کر دی کہ جناحؒ اور مسلم لیگ کا نظریہ اور مسلک غیر اسلامی ہے اور ہندو کا موقف "عین مطابق اسلام" (یا لاعجب) پچاس ہزار روپے میں، کفر اسلام ہوگیا اور اسلام کفر۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ع قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند! اس ارزاں فروشی کا اندازہ اُس خط سے لگائیے جو پنڈت جواہر لعل نہرو نے ۵ جولائی ۱۹۳۷ء کو جھانسی کے بائی الیکشن کے سلسلہ میں، مسٹر رفیع احمد قدوائی (مرحوم) کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:-

جہاں تک کارکنوں کا تعلق ہے وہ باہر سے بھیجے جا چکے ہیں اور ابوالکلام آزاد نے اس کی بابت حسین احمد مدنی اور بشیر احمد کو مطلع بھی کر دیا ہے اور احمد سعید کو تار بھی دے دیا ہے۔ انہیں سفر خرچ دینا چاہیئے۔ ہم کوشش کریں گے کہ مالی امداد بھی فراہم کی جائے۔ اس سلسلہ میں سات سو روپیہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے[1]

یہ تھی قیمت دو قومی نظریہ کو خلافِ اسلام اور متحدہ قومیت کو عین مطابق اسلام قرار دینے کی!

بورڈ سے علیحدگی

اس کے بعد احرار پارٹی کی باری آئی۔ یونینسٹ پارٹی کے سر فضل حسین (مرحوم) نے مشہور کر دیا کہ مسٹر جناحؒ نے بمبئی کے تاجروں اور راجہ محمود آباد سے پارلیمانی بورڈ کے لئے کئی لاکھ روپے حاصل کئے ہیں۔ اس سے احرار کے چودھری افضل حق اور مولانا حبیب الرحمٰن وغیرہ اس مغالطہ میں مبتلا ہو گئے کہ اس فنڈ میں سے کم از کم ایک لاکھ روپیہ ان کے حصے میں ضرور آئے گا۔ لیکن پارلیمانی بورڈ نے اس کے برعکس یہ شرط عائد کر دی کہ جس امیدوار کو لیگ کا ٹکٹ دیا جائے گا اسے پان سو روپیہ بورڈ کے فنڈ میں جمع کرانا ہوگا۔ اس سے ان کی امیدوں پہ پانی پھر گیا اور وہ بھی مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے[2] اور پھر بقایا عمر جناحؒ کو کافر قرار دینے کے "جہاد" میں گزار دی!

پنجاب میں یہ کچھ ہو رہا تھا تو مسلم لیگ کے مرکزی بورڈ میں حالات اس سے بھی زیادہ مایوس کن تھے۔ یو۔پی سے نواب چھتاری۔ سر محمد یوسف اور نواب زادہ لیاقت علی خان نے بورڈ سے استعفےٰ دے دیا۔

---

[1] JAMIL-UD-DIN AHMAD ——— MIDDLE PHASE OF MUSLIM POLITICAL MOVEMENT. P. 201.

[2] عاشق حسین بٹالوی ص ۳۲۶

اور مسلم لیگ کے بجائے نیشنل ایگریکلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یاد رہے کہ نواب زادہ لیاقت علی خان کو ابھی چند ماہ قبل آل انڈیا مسلم لیگ کا سیکرٹری منتخب کیا گیا تھا۔ یہ پارٹی کس قسم کی تھی اور ان حضرات کا خمیر کس قسم کی مٹی سے اٹھا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب نواب چھتاری نے یو۔پی کے گورنر کو ان ناموں کی فہرست بھیجی جنہیں پارلیمانی بورڈ میں شامل کیا جانا مطلوب تھا تو گورنر صاحب اس پر سخت برافروختہ ہوئے اور نواب صاحب نے معافیاں مانگتے ہوئے وہ فہرست واپس لے لی۔ اور . . . . . اپنے رفقا سمیت پارلیمانی بورڈ سے علیحدگی اختیار کر لی[1]۔ بہار سے سید حسین امام اور سید عبدالعزیز نے بھی بورڈ سے استعفیٰ دے دیا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق نے لیگ سے الگ ہو کر نہ صرف اپنی جداگانہ پارٹی ـــ کرشک پروجا پارٹی ـــ تشکیل کر لی بلکہ لیگ کے خلاف سب و شتم کا افسوس ناک سلسلہ بھی شروع کر دیا[2]۔

پنجاب سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے۔ یعنی ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی خان۔ راجہ صاحب (مرحوم) اس کامیابی کے بعد سیدھے یونینسٹ پارٹی کے جلسے میں پہنچے اور جاتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کو چھوڑ کر، یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے ہیں۔ سر سکندر حیات نے ان کا استقبال کرتے ہوئے جو تقریر کی اس میں انہوں نے فرمایا کہ

> راجہ صاحب میری مرضی اور میرے ایما سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے لیکن انہوں نے شروع ہی سے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے فوری بعد یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے[3]۔

مجھے عزیزانِ من! آج (پچاس سال کے بعد) ان گڑے مردوں کو اکھاڑنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن (چوں کہ تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب نہیں ہوئی) میں سمجھتا ہوں کہ ہماری نئی نسل کو (جس نے وہ دَور دیکھا ہی نہیں) یہ بتانے کی اشد ضرورت ہے کہ وہ کیا حالات تھے جن میں قائداعظمؒ نے اس مہم کا آغاز کیا تھا اور وہ کس قسم کے "رفقا" تھے جن کے ساتھ آپ کو پالا پڑا تھا! آپ سوچیے کہ اگر قائداعظمؒ کے سوا کوئی لیڈر بھی ہوتا تو وہ ان حالات سے بد دل ہو کر مسلمانوں کے سیاسی میدان کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو جاتا۔ لیکن یہ قائداعظمؒ کا عزمِ راسخ تھا جس نے ایسے نامساعد حالات اور اس قسم کی ہمت شکن مایوسیوں کا کوئی اثر نہ لیا اور کامل استقامت اور استقلال اور پوری دل جمعی اور سکونِ قلبی کے ساتھ اس وادیٔ پُرخار میں مردانہ وار آگے بڑھتے چلے گئے۔ اتنا ہی نہیں کہ وہ آگے بڑھتے گئے بلکہ ان کے حوصلے اور بھی بلند اور ان کی جرأتیں

---

[1] شریف المجاہد صاحب (روزنامہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۱ء)

[2] عاشق حسین بٹالوی: "اقبال کے آخری دو سال" (صفحہ ۳۴۲ - ۳۵۲)۔

[3] عاشق حسین بٹالوی "اقبال کے آخری دو سال" (صفحہ ۳۴۲ - ۳۵۲)۔

اور بھی بے باک ہوگئیں۔ (مثلاً) انہوں نے مارچ ۱۹۲۹ء میں مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے للکار کر کہا تھا کہ

میں انگریز اور ہندو دونوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں متفق ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نورِ ایمان زندہ ہے۔ زندہ رہا ہے۔ اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو۔ ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو۔ ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مرجائیں گے۔

اس سے بھی چند ماہ پہلے سندھ مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس (منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۸ء) میں کہا کہ

برطانیہ، ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ سے وہی بازی لے جاسکتا ہے جس کے پاس قوت ہو۔ لیکن ہم برطانیہ اور ہندو دونوں سے لڑیں گے۔

سچ ہے۔ مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

کفر کے فتوے

لیکن اس جہاد میں ہندو کی تیغ و سناں اور انگریز کی توپ و تفنگ سے کہیں زیادہ جگر پاش اور دل خراش ہمارے محافظانِ دینِ مبین کے کفر کے فتوؤں کے تیر و تبر تھے۔ انہی مولانا مدنی (مرحوم) نے جو پچاس ہزار روپیہ نہ ملنے پر، لیگ سے الگ ہو کر، کانگریس کی آغوش میں جا بیٹھے تھے۔ فتویٰ صادر فرما دیا کہ

مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے اور قائداعظم کافرِ اعظم ہے۔ (تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء صفحہ ۱۰۱)

اور اس مجلس احرار کے ایک ممتاز لیڈر (مولانا) مظہر علی اظہر نے۔ جس نے پانچ سو روپے پر لیگ کا ساتھ چھوڑا تھا، قائداعظم کی شادی کے سلسلہ میں ایک سراسر غلط اتہام لگاتے ہوئے کہا تھا کہ

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا۔ یہ قائداعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم (معاذ اللہ)۔

اور خود مجلسِ احرار نے اپنی ایک قرارداد میں کہا تھا کہ

یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادتِ عظمیٰ غیر اسلامی ہے۔

دوسری طرف سے آواز آتی تھی کہ

بحکم شریعت مسٹر جناح اپنے عقائدِ کفریہ، قطعیہ، یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ اور جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے۔ یا اس کے کافر و مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر و مرتد اور شر الخنام ہے۔ اور بے توبہ مرے تو مستحق لعنتِ عزیز علام؟

(فرقہ بریلوی کی کتاب منجانب اہل سنۃ عن اہل الفتنۃ ۔ صـــ ۱۲۳)

لیکن قائداعظمؒ پر ان فتووں کا کچھ اثر نہیں ہوتا تھا ۔ اس لئے کہ ایک تو وہ جانتے تھے کہ یہ حضرات ان سے کتنے پیسوں کا انتقام لے رہے ہیں[۱] ۔ اور دوسرے انہیں اس کا بھی علم تھا کہ ان کے فتوے بدلتے کس آسانی سے ہیں ۔ وہ جانتے تھے کہ جب کانگریس نے ترکِ موالات کا ریزولیوشن پاس کیا تو جمیعۃ العلماء نے بھی قرآن و حدیث کی بنا پر ترکِ موالات کا فتویٰ دے دیا ۔ پھر حالات بدلے۔ اور سی ۔ آر ۔ داس اور موتی لال نہرو نے کونسلوں کے مقاطعہ کی شرط اٹھا دی تو انہی مولوی صاحبان نے پہلا فتویٰ منسوخ کرکے کونسلوں میں داخلے کو جائز قرار دے دیا ۔ ۱۹۲۸ء میں انہی مولویوں کو کانگریس سے کچھ ذاتی پرخاش ہوئی تو جھٹ آغا خان اور سر شفیع کی قیادت قبول کرکے جداگانہ انتخاب کی حمایت اور نہرو رپورٹ کی مخالفت کا نیا فتویٰ صادر کر دیا[۲] ۔

(۸)

مخالفین یہ حربے استعمال کر رہے تھے اور جناحؒ کا یقینِ محکم اور عزم راسخ اُسے ان غوغا آرائیوں سے بے نیاز، جانبِ منزل رواں دواں لئے چلا جا رہا تھا ۔

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود   مانندِ کہکشاں بگمہ بیابانِ مرغزار
وا کردہ سینہ را بہ ہوا ہائے شرق و غرب   در برگرفتہ ہمسفرانِ زبون و زار
زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ ، از ہمہ بیگانہ می رود

پیامِ مشرق ۔ صـ ۱۵۱

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نہایت تلخ و یاس انگیز تجربات کے بعد قائداعظمؒ کے ناقابلِ شکست عزم نے اس تجویز پر صاد کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس (اپریل ۱۹۳۸ء میں) اسی لاہور میں منعقد کیا جائے ۔ علامہ اقبالؒ کو اس سے بڑی مسرت ہوئی ۔ شاید وہ (غیر شعوری طور پر) اپنے ۱۹۳۰ء کے خواب کی محسوس تعبیر کا پُرکیف نظارہ اپنی آنکھوں سے کرنا چاہتے تھے ۔ لیکن سر سکندر حیات اور اُس زمانہ کے خود پرداز پنجاب مسلم لیگ کے صدر نواب ممدوٹ (نواب سر شاہ نواز ممدوٹ) کی سازش سے وہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی ۔ لیکن قائداعظمؒ نے ہمت نہ ہاری تا آنکہ دو ہی سال بعد وہ اجلاس ، اسی لاہور میں ، اس استقبالیہ کمیٹی کے زیر اہتمام ، جس کے صدر وہی نواب ممدوٹ تھے ، اس شان و شکوہ اور عظمت و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا جس کی مثال تاریخ میں بمشکل ملے گی ۔ اسی کی یاد

---

[۱] اے کاش ! اُس وقت لیگ کے پاس پچاس ساٹھ ہزار روپیہ بھی ہوتا تو تحریکِ پاکستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا ۔ اور مملکتِ پاکستان کا رنگ بھی کچھ اور ۔ بعض اوقات کتنے چھوٹے چھوٹے واقعات تاریخ کا رخ بدل دیتے ہیں !

[۲] ہماری قومی جدوجہد ۱۹۳۰ء ۔ (عاشق حسین بٹالوی صـ ۲۰)۔

میں آج کی ہماری یہ تقریب منعقد ہو رہی ہے۔

لیکن اس اجلاس کا انعقاد قائد اعظمؒ کی استقامت اور عزم کا امتحان اپنے آغوش میں لئے تھا۔ یہ داستان بڑی حیرت انگیز بھی ہے اور جرأت آموز بھی، اس لئے میں اسے ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ بالخصوص اس لئے کہ یہ میری شنید نہیں دید ہے۔ میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ شاہد ہی نہیں بلکہ اس کارزار میں خود بھی شریک تھا۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے وقت مسلم لیگ کی کس مپرسی کی جو حالت تھی اسے ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس سے اگلے سال آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں منعقد کرنے کی تجویز کو جس طرح ناکام بنا دیا گیا تھا، وہ بھی ہماری نظروں سے گذر چکا ہے۔ لیکن اس مردِ آہن کی انتھک کوششوں اور بے پناہ ہمتوں نے دو ہی سال کے عرصہ میں قوم میں جو انقلاب پیدا کر دیا تھا اس کی نظیر بھی تاریخ میں کم ہی ملے گی۔ چنانچہ جب ۱۹۴۰ء کے اوائل میں یہ فیصلہ ہوا کہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مارچ میں لاہور ہی میں منعقد ہوگا۔ تو قوم نے جس ذوق و شوق، جس جوش و خروش، جس دبدبہ اور طنطنہ سے اس فیصلہ کا استقبال کیا اس سے نظر آتا تھا کہ یہ دو سال پہلے کی قوم نہیں۔ ایک نئی قوم ہے جو تازہ امنگوں اور پُرکیف آرزوں کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے اپنے نصب العین کی طرف بڑھے چلی جا رہی ہے۔ ہر نگہ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ یہ قوم نہیں، پُرخلوص دلوں کا ایک سمندر ہے جس کی تلاطم خیزیوں کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔ ہماری نئی نسل کی حرماں نصیبیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اس قوم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں جو خلوص و ایثار کا شعلہ جوالہ تھی۔ اس نے اس قوم کو دیکھا ہے جو راکھ کا ڈھیر اور افسردگیوں اور مایوسیوں کا ماتم کدہ ہے۔ غالبؔ نے اس تقابل کو جس دل کش لیکن حسرت آمیز انداز سے بیان کیا ہے اس سے بہتر منظر کشی ممکن نہیں۔ اس نے سو سال پہلے جو کچھ کہا تھا وہ آج ہمارے حال پر صادق آتا ہے۔ اُس نے کہا تھا ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائ و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

بہرحال، اس اعلان پر کہ لیگ کا سالانہ اجلاس، مارچ میں لاہور میں منعقد ہوگا، سارا ملک، دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا بہار آفریں منظر پیش کر رہا تھا، اِدھر قوم کی یہ کیفیت تھی لیکن دوسری طرف اس کے مخالفین کی چھاتی پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ ان کی مذموم کوشش تھی کہ کچھ ایسا

کیا جائے کہ یہ اجلاس منعقد نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کے لئے کانگریس کے منتخب صدر (مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم) لاہور آئے اور سر سکندر حیات (مرحوم) سے خفیہ ملاقات کی۔ اس میں کیا طے پایا اس کی کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوئی۔ اجلاس کی تاریخیں قریب تر آتی گئیں۔ لوگوں کا ولولہ شوق تیز تر ہوتا گیا۔ تیاریاں زور پکڑتی گئیں۔ کہ جلوس صدر مسلم لیگ (قائداعظمؒ) کے عین دو دن پہلے (۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کی) شام کے قریب یہ وحشت انگیز خبر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی کہ لاہور میں خاکساروں کے جلوس پر گولی چلا دی گئی ہے۔ اس سے تمام شہر ماتم کدہ بن گیا۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔ بلکہ کرفیو لگا دیا گیا۔ مجھے اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع ذرا پہلے مل گئی تھی۔ میں (علامہ مشرقی مرحوم سے ملنے کے بعد، جو اس وقت دھلی آ گئے تھے) اس خبر کو قائداعظمؒ کے گوش گزار کرنے کے لئے ان کے دولت کدہ پر پہنچا۔ وہ منظر اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میں ان سے اس موضوع پر باتیں کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا۔ مجھے اندازہ تو پہلے ہی ہو گیا تھا۔ قائداعظمؒ نے بعد میں بتایا کہ لاہور سے، نواب شاہ نواز (مرحوم) چیئرمین استقبالیہ کمیٹی کا فون تھا۔ ادھر سے کیا کہا جا رہا تھا اسے تو میں سن نہیں سکتا تھا۔ ادھر کیفیت یہ تھی کہ ایک ایک فقرہ پر، پورے دبدبے اور طنطنے کے ساتھ کوہ آسا عزم و اعتماد کا اظہار ہو رہا تھا۔ آخری فقرہ کچھ اس طرح کا تھا کہ خواہ مارشل لا نافذ ہو یا کرفیو لگے۔ یہ اجلاس منعقد ہوگا اور ہر حال میں ہوگا۔ میں پروگرام کے مطابق لاہور پہنچ رہا ہوں۔ چنانچہ وہ پروگرام کے مطابق لاہور پہنچے اور جس شان و شوکت، لیکن انتہائی سکوت و سکون کے ساتھ وہ اجلاس منعقد ہوا چشم فلک نے اس کی مثال کم دیکھی ہوگی۔

لاہور کا اجلاس

(ضمناً) معلوم نہیں! یہ قائداعظمؒ کی ذات کے ساتھ لوگوں کی والہانہ عقیدت اور احترام تھا یا ان کی شخصیت کی سحر انگیزی۔ اُس زمانے میں قائداعظمؒ اردو کے چار لفظ بھی نہیں جانتے تھے۔ کیفیت یہ ہوتی تھی کہ لاکھوں کا مجمع ہے جس میں نوے فی صد سامعین انگریزی کا ایک لفظ نہیں سمجھتے۔ قائداعظمؒ، دو دو تین تین گھنٹوں تک انگریزی میں تقریر کر رہے ہیں اور کیا مجال کہ اس لاکھوں کے مجمعے میں کسی کے کھانسنے تک کی آواز بھی سنائی دے! اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ قوم کس قدر (DISCIPLINED) ہو چکی تھی۔ آج سیاسی بیداری نام رہ گیا ہے ہنگامہ خیزی، غوغا آرائی اور فساد انگیزی کا۔ یہ قائداعظمؒ کی تربیت یا ان کے ذاتی کردار کا غیر شعوری اثر تھا کہ قریب دس سالہ تحریک پاکستان کے دوران، جب چاروں طرف مخالفت کی آگ بھڑکائی جا رہی تھی۔ وابستگان تحریک کی طرف سے نہ کسی جگہ کسی قسم کا ہنگامہ برپا کیا گیا، نہ فساد کھڑا کیا گیا۔ قوم پر رہنمایانِ قوم کی سیرت و کردار کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ منافقانہ نہ ہو بلکہ خلوص اور صداقت پر مبنی ہو۔ قائداعظمؒ نے قوم کو، یقین، اتحاد اور ضبط کا جو سلوگن دیا تھا، قوم اس کی محسوس

بن گئی تھی۔ ان پُر آشوب اور صبر آزما حالات میں قرار دادِ پاکستان منظور ہوئی جسے اس تحریک کے سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ تاریخ اس ستم ظریفی اور بوالعجبی کو کس طرح فراموش کر دے کی کہ جس وقت "مسٹر جناح" یہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم ایک ایسا خطہ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں جس میں حضور نبی اکرمؐ کے نقوشِ قدم کے اتباع میں اسلامی مملکت قائم کی جائے گی، (مولانا) ابوالکلام آزاد (جنہیں کسی زمانے میں امام الہند کہہ کر پکارا جاتا تھا) رام گڑھ کے مقام پہ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت میں یہ دیا کھیان دے رہے تھے کہ

> وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو تھکنے نہیں دیتا۔

مسٹر جناح یہ کہہ رہے تھے کہ مسلمان، دین کے اشتراک کی بنا پر، ہندوؤں۔ بلکہ ساری دنیا کے غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مولانا آزاد یہ فرما رہے تھے کہ

> یہ تخیل کہ مسلمان بر بنائے مذہب ایک جداگانہ قوم ہیں اور ہندوستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو اور دوسری مسلمان۔ انگریزوں کا وضع کردہ ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک، اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔

قرار داد پاکستان کی مخالفت، اکیلے (مولانا) ابوالکلام آزاد کی طرف سے ہی نہیں ہوئی تھی۔ تمام نیشنلسٹ مسلمان اس کی مخالفت میں انتہائی گرم جوشی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جمیعت العلماء ہند (جس کے نامور سربرآوردگان کے کردار کی ایک جھلک ہم انتخابات ۱۹۳۷ء کے پچاس ہزار روپیہ کے مطالبہ کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں)۔ احرارِ اسلام۔ سرخ پوش۔ وغیرہم، سب کی طرف سے مخالفت ہوئی تھی۔ سندھ کے خان بہادر الہ بخش (مرحوم) نے اس قرار داد کے متعلق کہا تھا:۔

> یہ اسکیم آزادیٔ ہند کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہے۔

عبدالرحمٰن سرحدی نے کہا:۔

> یہ ہندوستان میں برطانوی تسلط قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے فرمایا:۔

> اس سے برطانوی حکومت قائم رہے گی۔

احراری لیڈر (مولانا) حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کہا:۔

> یہ اسکیم ملک کے مفاد کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے بالخصوص نقصان رساں ہے۔ اگر کبھی اسلامستان وجود میں آیا تو احرار کے ہاتھوں آئے گا۔

سب سے زیادہ دل چسپ کردار سر سکندر حیات (مرحوم) کا تھا۔ ان کی مخالفت کے علی الرغم جب یہ اجلاس منعقد ہو گیا تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ وہ اس کمیٹی میں شامل ہیں جس نے قرار دادِ پاکستان کا مسودہ مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد ہم انہیں اسلامیہ کالج کے طلبا کو یہ نصیحت کرتے ہوئے سنتے ہیں کہ

زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی ہو سکین یاد رکھو۔ تم کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشاء ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لئے الگ خطہ منتخب کرنا ہو۔ یہ اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہوگا۔

سر سکندر کی طرف سے اس مخالفت کا نتیجہ تھا کہ ان کی پارٹی (یونینسٹ) کے سربراہ سر چھوٹو رام کہتے تھے کہ

سر سکندر کسی خالص اسلامی حکومت میں وزیر اعظم تو ایک طرف، کوئی ذمہ داری کا عہدہ لینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں گے۔ پنجاب میں صرف پنجابیوں کی حکومت ہوگی۔

مخالفتوں کے اس تمام ہجوم میں، عزم راسخ کا یہ فولادی پیکر، چٹان کی طرح کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا کہ

لاہور کے پلیٹ فارم ہی سے مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ اور آج (یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو) میں اسی پلیٹ فارم سے اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان (ایک ایسی منزل ہے جس تک پہنچنے سے مسلمانوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کے براعظم میں پاکستان کے سوا کوئی دستور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پاکستان بن کر رہے گا۔

(۰)

مودودی مرحوم کی مخالفت

یہ مخالفتیں ہنگامی اور وقتی تھیں۔ جوں جوں ان کا اثر کم ہوتا گیا، یہ ماند پڑتی گئیں۔ لیکن سب سے زیادہ شدید اور دور رس مخالفت ایک اور گوشے کی طرف سے ہوئی۔ یہ مخالفت تھی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف سے ان کی طرف سے مخالفت بڑی غیر متوقع بھی تھی۔ اور تعجب انگیز بھی۔ یہ پہلے کانگریسی تھے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک نیشنلسٹ علماء کے آرگن الجمعیۃ کے حلقہ ادارت میں شامل رہے اور گاندھی جی کی سوانحعمری بھی مرتب کی۔ پھر یہ حیدرآباد (دکن) چلے گئے اور وہاں علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ دو قومی نظریہ کی تائید میں مضامین لکھتے رہے۔ اس سے یہ مسلم لیگی حلقوں میں قدرے مقبول ہوئے تو یہ کہتے ہوئے پنجاب کی طرف آ گئے کہ وہ علامہ اقبالؒ کے مشن کی تکمیل کے لئے آ رہے ہیں۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے جب اپنے پاؤں جما لئے تو بقایا ساری عمر (تقسیم ہند سے پہلے تحریک پاکستان کے دوران اور تشکیلِ پاکستان کے بعد مرتے دم تک) علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصورِ پاکستان کی مخالفت میں بسر کی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے مشن میں سب سے زیادہ کامیاب رہے۔ علامہ اقبالؒ نے مملکتِ پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس سے وہ نقوش مٹ جائیں گے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں مذہبی پیشوائیت کی وساطت سے اسلام پر لگ چکے تھے اور جس سے اس کی اصل صورت مسخ ہو کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اور قائداعظمؒ نے بار بار اعلان کیا تھا کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی قائم نہیں ہوگی۔ مودودی (مرحوم) کی پہلے تو یہ اسکیم تھی کہ پاکستان بننے ہی نہ پائے۔ اور جب یہ بن گیا تو انہوں نے یہ اسکیم مرتب کی کہ جس تھیاکریسی کو مٹانے

کے لئے اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے اس مملکت کو قائم کرایا ہے، اس میں وہی تھیاکریسی مسلط رہے۔ چنانچہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے) اس وقت پاکستان میں جو تھیاکریسی مسلط ہو رہی ہے، وہ مودودی (مرحوم) کی اسکیم ہی کا نتیجہ ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہم نے کہا ہے کہ مودودی (مرحوم) اپنے مشن میں کامیاب رہے ہیں۔ چونکہ طلوع اسلام کا مشن پاکستان میں (اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصور کے) اس اسلام کو برسر اقتدار لانا تھا جس میں تھیاکریسی کا کوئی عمل دخل نہ ہو، اس لئے وہ مودودی (مرحوم) کی اسکیم کی مخالفت میں ان کے ساتھ شانہ بشانہ ہمسفر رہا۔ اس سلسلہ میں، اس میں مسلسل اور متواتر لکھا جاتا رہا اور اس کثرت سے کہ اسے یک جا کرنے سے ضخیم کتابیں مرتب ہو جائیں۔ طلوع اسلام میں جو کچھ لکھا گیا اسے بار بار دُھرانے کی ضرورت اس لئے پیش آتی رہی کہ (دیگر مخالف جماعتوں نے) تشکیل پاکستان کے بعد اس کا اعتراف کر لیا کہ انہوں نے واقعی اس تحریک اور مطالبہ کی مخالفت کی تھی لیکن مودودی (مرحوم) اور ان کی جماعت برابر یہ کہتی چلی گئی کہ انہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت قطعاً نہیں کی تھی۔ میں نے اس وقت اس تلخ داستان کے دھرانے کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اس وقت جس اسلام کو پاکستان میں نافذ کیا جا رہا ہے وہ مودودی (مرحوم) ہی کی اسکیم کا نتیجہ ہے۔

مرحوم نے (پنجاب آنے کے بعد) تحریک پاکستان کے خلاف بالعموم اور قائداعظمؒ کے خلاف بالخصوص اپنے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جسے بعد میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کا نام تھا "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم۔ ذیل میں جو اقتباسات پیش کئے جائیں گے وہ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن سے ماخوذ ہیں جو آرمی پریس۔ دہلی۔ میں چھپا تھا۔ ان اقتباسات کو غور سے ملاحظہ فرمائیے۔

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ مودودی (مرحوم) نے کہا کہ وہ کون سے مسلمان ہیں جن کے الگ قوم ہونے کا آپ دعوے کر رہے ہیں؟

> یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے، اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اُسے ترک کیا ہے۔ اُن کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے، کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے

جو کام بھی ہوگا، اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ (جلد سوم ص۱۳۱)
یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے، وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ (جلد سوم۔ ص۱۶۶)
اِن وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد، جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لئے قریب قریب بالکل بے کار ہو چکی ہے۔ اِس کی تعداد کے بھروسے پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (جلد سوم۔ ص۵۶)

دوسری جگہ لکھا :-
اگر آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے۔ (جلد سوم ص۳۱)
اسلام کو تانبے کے ان سکّوں کا خزانہ مطلوب نہیں جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگایا گیا ہو۔ وہ سکّہ کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکّہ ان جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے، اس کے نزدیک، زیادہ قیمتی ہے۔ (جلد سوم ص۱۶۷)
یہ تو رہا مسلم قومیت کے متعلق۔ ان کی قیادت (لیڈر شپ) کے متعلق کہا :-
افسوس کہ لیگ کے قائداعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (جلد سوم۔ ص۳۷) ایسے لوگوں کو محض اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استادِ فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔ (جلد سوم۔ ص۷) ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ (جلد سوم۔ ص۴۷)

مسلم لیگ کی قیادت کے خلاف

اس کے بعد کہا :-
اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں، ایک

بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دل چسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔ (جلد سوم۔ ص)

مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے جواز، بلکہ ضرورت کے لئے دلیل یہ دی جاتی تھی کہ اس میں اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ اس حقیقت کو ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک برابر دہرایا جاتا رہا۔ لیکن مودودی (مرحوم) کا ارشاد یہ تھا کہ

مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے، ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، اُن کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔ (جلد سوم۔ ۱۳۲ - ۱۳۰)

جو کچھ مودودی (مرحوم) اس وقت کہتے تھے، اسے آپ نے سُن لیا۔ اس کے برعکس حقیقت کیا تھی اس کے متعلق ہم سے نہیں، خود مودودی صاحب کی زبان سے سُنئے۔ انہوں نے ۱۹۷۶ء میں ایک بیان دیا تھا جو روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۴ اگست ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ

اس تحریک کے آغاز ہی سے عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی تمناؤں کا مرکز، پاکستان، ایک اسلامی مملکت ہوگا جس میں اسلام کا قانون جاری ہوگا اور اسلامی تہذیب زندہ کی جائے گی۔ اسی لئے ان کا نعرہ یہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا ——— لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ——— مسلم لیگ کے لیڈر بھی اپنی تقریروں میں یہی خیال ظاہر کر رہے تھے اور سب سے بڑھ کر، خود قائد اعظمؒ مرحوم و مغفور نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا دستور قرآنی ہوگا۔

اس کے باوجود وہ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں کہتے تھے کہ

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دل چسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔

(جلد سوم ص ۹۳)

اس زمانے میں ان سے کہا گیا کہ چلئے! مسلمانوں میں ہزار نقص سہی۔ مسلم لیگ اور اس کی قیادت بھی آپ کے نزدیک اسلامی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ لیکن اس وقت جو جنگ ہو رہی ہے اس میں مطالبہ صرف اتنا ہے کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں اپنی آزاد مملکت قائم کر لی جائے۔ اگر یہ الگ خطۂ زمین مل گیا تو اس میں اسلامی مملکت قائم ہو جانے کا امکان تو ہو گا۔ آپ وہاں اسلامی حکومت قائم کر لیجئے گا۔ اس کے جواب میں وہ کہتے تھے۔

> بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (جلد سوم۔ ص۱۶۸)

تاریخ پاکستان میں ۴۶-۱۹۴۵ء کا زمانہ بڑا نازک تھا۔ انگریز اور ہندو نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر ایک بار الیکشن پھر کرائے جائیں تو مسلم لیگ کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے دعوے کی قلعی کھل جائے گی۔ اس مقصد کے لئے ۱۹۴۶ء میں انتخابات کا فیصلہ کیا گیا۔ ان انتخابات کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قائد اعظمؒ (اپنی انتہائی خرابیٔ صحت کے باوجود) ملک بھر میں مسلسل دورے کر رہے تھے اور مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ یاد رکھو۔

> اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم ناکام رہ جائیں گے بلکہ اس برصغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ (۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو قوم کے نام خطاب)

اس وقت ایک ایک ووٹ فیصلہ کن حقیقت بن سکتا تھا۔ ایسے نازک وقت میں مودودی (مرحوم) سے کہا گیا کہ وہ انتخابات میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ

> ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو، اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، بہرحال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔

(اخبار کوثر۔ مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء۔ بحوالہ "مولانا مودودی کے دعاوی اور عمل" ص۸)

آخری وقت تک مخالفت

مودودی (مرحوم) کی اس قدر شدید مخالفت کے باوجود قائد اعظمؒ کو کامیابی حاصل ہوئی اور حکومتِ برطانیہ نے فروری ۱۹۴۷ء میں اعلان کر دیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک ملک کو تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس پر مودودی صاحب نے سوچا کہ مسلم

اکثریت کے صوبے ان کی مخالفت سے متاثر نہیں ہوئے تو اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان کے خلاف اکسانا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے جماعت اسلامی کے وفود نے اقلیتی صوبوں کا رُخ کیا اور اپریل ۱۹۴۷ء کے اواخر میں ٹانک، مدراس اور پٹنہ میں جماعت کے مخصوص اجلاس منعقد کئے۔ ان میں مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں سے کیا کہا جاتا تھا، اس کا اندازہ خود مودودی صاحب کی ایک تقریر سے لگایئے جو انہوں نے ۲۵ر اپریل ۱۹۴۷ء کو مدراس میں کی تھی۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:-

> ہندو اکثریت کے علاقوں میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کر لیں گے کہ جس قوم پرستی پہ انہوں نے اپنے اجتماعی رویہ کی بنیاد رکھی تھی وہ انہیں بیابانِ مرگ میں لا کر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے ایک ایسے نتیجے پر ختم ہوئی ہے جو ان کے لئے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ (روئدادِ جماعت اسلامی۔ حصہ پنجم۔ ص۱۱۴ و ص۱۱۵)

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ تحریک پاکستان کی بجائے اگر مسلمانانِ ہند اس دعوت کو قبول کر لیتے جو وہ دے رہے تھے:-

> تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا، اور دو چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے۔ (یاد رکھیے) جوں ہی ہندوستان کی سیاست کا موجودہ دَور ختم ہو کر نیا دَور شروع ہوا، اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی واقعی یاس انگیز پوزیشن کا عام احساس شروع ہو جائے گا۔ (ایضاً)

ان کے ایک اہم رفیق، ملک نصراللہ خان (مرحوم) نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اسلام کے نفاذ اور اقامتِ دین کے لئے کسی خطۂ زمین کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ پٹنہ کے اجلاس میں انہوں نے اپنی تقریر کے دوران کہا:-

> بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین کے آغاز سے پہلے زمین کا ایک قطعہ حاصل کر لینا ضروری ہے جہاں دین کو برپا کر سکیں۔ حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھدار اور بظاہر معقول اور عالم دین لوگوں تک کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ ایسی باتیں وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو یا تو سیاست اور فلسفۂ اجتماع سے کلیتاً نابلد ہیں اور محض اِدھر اُدھر سے چند باتیں اور نعرے سن سنا کر سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے ہیں اور کوئی اور سمجھدار آدمی موجود نہ ہونے کی وجہ سے لیڈری کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ یا پھر نفس پرستی میں مبتلا اور خدا کے خوف سے آزاد ہونے کی وجہ سے ان پڑھ اور حقائق و سیاست سے ناواقف عوام کو بے وقوف

بناتے ہیں تاکہ وہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائیں۔ ورنہ موٹی بات ہے کہ حکومت کے قیام کے لئے آپ کو اینٹ اور گارے کی ضرورت نہیں کہ آپ قطعاتِ زمین تاکتے پھریں۔ اس کے لئے آپ کو زمین کی نہیں بلکہ ایک ایسی مضبوط اور منظم جماعت کی ضرورت ہے جو آپ کے پیشِ نظر نظریۂ حکومت کو ماننے اور اس کے لئے مرمٹنے والی ہو۔ اگر آپ نے ایسی جماعت پیدا کر لی تو جہاں بھی وہ ہوگی وہیں وہ اس نظریے کی حکومت قائم کرلے گی۔ (ایضاً۔ صـ۱۵۴)

(ضمناً) مسلم اقلیتی صوبوں کو مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کے لئے اکسانے کی اسکیم، مودودی (مرحوم) کی اپنی نہیں تھی۔ یہ درحقیقت (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی صدائے بازگشت تھی انہوں نے اپریل ۱۹۴۶ء میں ایک بیان جاری کیا تھا جس میں پہلے کہا تھا کہ

مجھے اعتراف ہے کہ پاکستان کی اصطلاح ہی میری روح کے خلاف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کرۂ ارض کے بعض حصے پاک ہیں اور باقی ناپاک۔ زمین کے مختلف خطوں کی "پاک اور ناپاک" کی یہ تقسیم یکسر غیر اسلامی اور اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ اسلام اس قسم کی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا۔ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ "خدا نے پورے کرۂ ارض کو میرے لئے مسجد بنایا ہے"۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا:۔

آیئے! ذرا جذبات سے ہٹ کر سوچیں کہ اگر پاکستان کی اسکیم عمل میں آگئی تو اس کے نتائج اور عواقب کیا ہوں گے۔ اس سے ہندوستان دو مملکتوں میں بٹ جائے گا ایک میں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور دوسری میں ہندو۔ ہندوستانی مملکت میں قریب ساڑھے تین کروڑ مسلمان رہ جائیں گے جو مختلف گوشوں میں اقلیت کی حیثیت سے بکھرے ہوں گے .... ان علاقوں میں انہوں نے ہزار سال سے اپنے مساکن تعمیر اور مسلم ثقافت اور تہذیب کے مراکز قائم کئے تھے۔ وہ ایک صبح اٹھیں گے اور اپنے آپ کو ان علاقوں میں اجنبی اور حریف پائیں گے۔ وہ صنعت و حرفت، تعلیم اور معاشیات میں، (ہندوؤں سے) بہت پیچھے ہوں گے اور اپنے آپ کو اس مملکت کے رحم و کرم پر محسوس کریں گے جس میں اس وقت خالصتہً ہندو راج ہوگا۔[1]

یہ تھا مخالفتوں کا وہ ہجوم جس کا مقابلہ، قائداعظمؒ کی جانِ ناتواں اکیلے کر رہی تھی۔ یہ سب اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم اور اس کے حصول کے لئے عزمِ راسخ کی بدولت تھا۔ سچ ہے۔

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

---

[1] INDIA WINS FREEDOM. P.P. - 142.43

جس شخص کو اپنے مسلک کی صداقت پر یقین محکم ہو، وہ اپنے اصولوں کے معاملہ میں کسی کے ساتھ
کسی قسم کی سودے بازی کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مقام پر چٹان کی طرح کھڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ
مصالحت یا مفاہمت کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بڑے سے بڑا لالچ یا مہیب سے مہیب خطرہ اس
کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ دو ٹوک بات کرتا ہے جس میں نہ کسی قسم کا ابہام ہوتا ہے
نہ التباس۔ وہ اپنا دعوٰے صاف اور واضح الفاظ میں پیش کرتا ہے اور اس باب میں نہ کسی قسم کی مداہنت
سے کام لیتا ہے نہ منافقت برتتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

قائداعظمؒ کی زندگی ایسی قسم کی ہم آہنگیٔ قلب و زبان کی مظہر تھی۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے
تحت ہندوستان کو فیڈریشن بنانے کی تجویز پیش کی گئی تو قائداعظمؒ نے اس کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔
انگریز کی انتہائی خواہش تھی کہ وہ اسکیم پروان چڑھ جائے۔ قائداعظمؒ کو ہمنوا بنانے (یا یوں کہئے کہ خریدنے) کے لئے
برطانیہ کے وزیراعظم لارڈ رمزے میکڈانلڈ نے انہیں ذاتی ملاقات میں کہا کہ اگر سنہا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا
ہے تو کوئی اور بھی بن سکتا ہے۔ اگر سنہا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کوئی اور بھی ایسا کر سکتا ہے۔ اس
نے سمجھا کہ ایک صوبے کی گورنری یا لارڈ کا خطاب اتنی بیش بہا قیمت ہے جس کے عوض کسی ہندوستانی کو بھی
خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ
کہا اور خاموشی سے وزیراعظم کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ اس پر وہ بڑا متعجب ہوا اور الوداعی الفاظ کہنے کے
ساتھ پوچھ ہی لیا کہ آپ کا ایسا ردِ عمل کیوں ہوا؟ قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں انتہائی متانت کیساتھ کہا کہ
"اب میں آپ سے آئندہ کبھی نہیں ملوں گا، کیونکہ آپ مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہیں"۔
لارڈ لنلتھگو اپنے رعب و داب کیلئے بڑا مشہور تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران اس نے وار کونسل مقرر
کی اور اس میں مسلم لیگی وزراء مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات کو بھی شامل کر لیا۔ قائداعظمؒ نے
وار کونسل کو بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور ان دونوں سے کہا کہ وہ وار کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔
جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائداعظمؒ کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے لئے گیارہ بجے
کا وقت مقرر تھا۔ لیکن قائداعظمؒ ٹیلی فون پر بار بار یاد دہانی کے باوجود سوا گیارہ بجے سے پہلے وائسرائیگل لاج
نہ پہنچے ——— یہ اس لئے کہ وائسرائے کو معلوم ہو جائے کہ اس کی یہ حرکت قائداعظمؒ کے لئے کس قدر برافروختگی کا موجب
ہوئی ہے۔ وہاں جا کر قائداعظمؒ نے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ آپ کو میرے بیان
سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے، میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے۔ قائداعظمؒ نے اس
کے جواب میں کیا کہا؟ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے آپ کی وضاحت
کی کوئی ضرورت نہیں، کمرے سے باہر نکل آئے۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز ہندو لیڈر مسٹر
دوارکا داس کانجی نے لکھا تھا۔

یہ دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر اٹھتی ہے کہ ہندوستان میں مسٹر جناح کی قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر صداقت اور بیباکی تھی کہ اس نے انگریز وائسرائے کے منہ پر کہہ دیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے جب کہ باقی ہندوستانی لیڈر، جن میں کانگریس ہائی کمان بھی شامل ہے، اس وائسرائے کو بہترین انگلش جنٹلمین اور بہترین عیسائی جنٹلمین جیسے خطابات سے نواز کر اس کی چاپلوسی کرتے تھے۔

یہ اس لئے کہ ایک اصول پرست انسان کے دل میں مصلحت آمیزی کا خیال تک نہیں پھٹکتا جو وہ منافقت کا انداز اختیار کرے۔ مروجہ الفاظ میں یوں کہئے کہ قائداعظمؒ کے لغت میں "نظریہ ضرورت" جیسے الفاظ ملتے ہی نہیں۔ اقبالؒ نے کس قدر سچ کہا ہے کہ

عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی ۔۔۔ پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل

قائداعظمؒ کا اپنے مشن کے ساتھ عشق، نہایت پختہ تھا اس لئے اس میں مصلحت کوشی کا شائبہ تک بھی بار نہیں پا سکتا تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر ان کی خدمت میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا

انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت اور واضح ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابل تسخیر حریف تھے۔

عصر حاضر کی میکیاولی سیاست میں حصول مقصد کے لئے جو حربہ بھی استعمال کیا جائے جائز قرار پاتا ہے۔ لیکن قائداعظمؒ کے نزدیک سیاست میں اس قسم کی روش کس قدر قابل مذمت تھی اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے جسے مرزا اصفہانی نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۶ء کا کا ذکر ہے۔

کلکتہ کے مسلم چیمبر آف کامرس کی ایک نشست خالی ہوئی۔ اس کے لئے مسٹر اصفہانی بطور مسلم لیگی امیدوار کھڑے ہوئے۔ انتخاب بلا مقابلہ ہو رہا تھا کہ تاریخ نامزدگی سے دو دن پہلے، بالکل خلاف توقع ایک اور صاحب نے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے۔ اس زمانے میں انتخاب کے معنی محض ایک آدھ نشست حاصل کر لینا نہیں تھا۔ اس سے مسلم لیگ کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے دعویٰ کا ثبوت بہم پہنچتا تھا۔ اس لحاظ سے فریق مقابل کا یوں سامنے آجانا وجہ پریشانی ہو گیا۔ ایک شام (مرحوم) عبدالرحمٰن صدیقی بھاگے بھاگے آئے اور اصفہانی صاحب کو یہ مژدہ سنایا کہ انہوں نے فریق مخالف کو اس پر رضامند کر لیا ہے کہ اگر ہم اس کے زر ضمانت کا مبلغ اڑھائی سو روپیہ ادا کر دیں تو وہ مقابلہ سے دستبردار ہو جائے گا۔ ہم اس سے بہت خوش ہوئے۔ قائداعظمؒ ہم سے ذرا فاصلے پر بیٹھے تھے۔ ان کے کان میں بھنک سی پڑی تو انہوں نے صدیقی صاحب سے کہا کہ ذرا اپنی بات کو دہرائیے

انہوں نے بات سُنائی تو قائداعظم نے سخت برافروختہ ہو کر کہا کہ
تم نے کیا کہا ہے؟ پیسے دے کر فریق مخالف کو بٹھا دینا! یہ بالواسطہ رشوت نہیں تو اور کیا ہے
ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جاؤ! اور اس سے کہو کہ ہمیں یہ منظور نہیں۔ ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے جو اصول بیان فرمایا وہ سُننے کے قابل ہے۔ انہوں نے مسٹر اصفہانی سے کہا:۔

میرے عزیز! یاد رکھو۔ پبلک لائف میں اخلاقی دیانت، پرائیویٹ لائف سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہے۔ (پرائیویٹ لائف میں بددیانتی سے کسی ایک شخص کو نقصان پہنچتا ہے لیکن) پبلک لائف میں بددیانتی سے لاتعداد انسان مجروح ہوتے ہیں اور اس سے ہزارہا ایسے لوگ بے راہ رو ہو جاتے ہیں۔ جن کا آپ پر اعتماد ہوتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ سرمایہ داروں، جاگیرداروں۔ وڈیروں کی جماعت تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں کے اکثر لوگ مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا قائداعظم نے ان لوگوں کو ساتھ رکھنے کیلئے اپنے اصولوں میں کوئی لچک پیدا کر لی تھی یا ان سے کچھ جھوٹے دعوے کر رکھے تھے۔ قطعاً نہیں۔ انہوں نے انہیں واضح کر دیا تھا کہ پاکستان میں نظام سرمایہ داری قطعاً بار نہیں پا سکے گا۔ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ (دہلی) کے سیشن میں اعلان کیا تھا کہ

زمینداری اور سرمایہ داری

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں، خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے! اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا! اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے

دوسری طرف انہوں نے قوم کو اس سے بھی متنبہ کر دیا کہ جس طرح نظام سرمایہ داری خلاف اسلام ہے اسی طرح کمیونزم کا نظام بھی قرآن کے خلاف ہے۔ چنانچہ انہوں نے ۹ مارچ ۱۹۴۸ء کو مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

اب کچھ دنوں سے ایک پارٹی بہت متحرک ہو گئی ہے۔ وہ ہے کمیونسٹ! ان کا پراپیگنڈہ بڑا پُرفریب ہے اور میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ ان کے جال میں نہ پھنس جانا۔ ان کا پراپیگنڈہ دام ہمرنگِ زمیں ہے۔ ایک خطرناک پھندا ہے۔ وہ سوشلزم، کمیونزم،

نیشنل سوشلزم وغیرہ کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یاد رکھو! ہمارے ہاں ان "ازمز" یا اس قسم کی کسی اور ازم کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ (تقاریر جناحؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۴)

پھر انھوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس منعقدہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۴ء کے آخری اجلاس میں فرمایا:-

یہ کمیونسٹ سمجھتے ہیں کہ ہم بے وقوف ہیں۔ ان کے اس قسم کے مغالطہ میں رہنے کے لئے کچھ وجہ جواز ضرور ہے لیکن (یہ قصۂ ماضی ہے) گزشتہ پانچ دس سال میں مسلمانوں میں ایسی تبدیلی آچکی ہے کہ کمیونسٹ انہیں بے وقوف بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ اس لئے میں انہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہم سے دستبردار ہو جائیں۔ اگر انہوں نے پھر سے وہی کھیل کھیلنا چاہا تو انہیں ایسا منہ توڑ جواب دیا جائے گا (جسے وہ یاد رکھیں گے)۔ ہم مسلم لیگ کے ہلال اور ستارہ کے پرچم کے سوا کوئی پرچم نہیں چاہتے۔ اسلام ہمارا رہنما بھی ہے اور مکمل ضابطۂ حیات بھی۔

ہم کوئی زرد یا سرخ جھنڈا نہیں چاہتے۔ ہم کوئی ازم بھی نہیں چاہتے۔

(بحوالہ، نوائے وقت، مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۷۶ء)

قائداعظمؒ کے ذوقِ یقین، حسن تدبر، دیانتدارانہ سیاست اور عزمِ راسخ کی بدولت وہ خطۂ زمین حاصل ہو گیا جس میں قرآنی نظامِ مملکت قائم کیا جانا مقصود تھا۔ اس سے ان مذہبی جماعتوں نے جنہوں نے اس کی آخر تک مخالفت کی تھی ہمت نہ ہاری۔ وہ ہجوم کرکے ادھر آگئیں۔ انہوں نے یہاں آکر یہ اسکیم مرتب کی کہ یہ خطۂ زمین تو حاصل ہوگیا ہے لیکن اس میں وہ نظام قائم نہ ہونے پائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا ہے۔ قائداعظمؒ نے حصولِ پاکستان کے بعد اعلان کیا تھا کہ کچھ بھی ہو:-

یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۶۵)

قائداعظمؒ ان مخالف قوتوں کو یہ چیلنج دے کر دنیا سے تشریف لے گئے اور انہوں نے میدان خالی پاکر اپنی اسکیم کو آگے بڑھانا شروع کر دیا۔

یہ حضرات اپنی اسکیم کو اس دریا کی پرسکوت روانیوں کی طرح آگے بڑھاتے رہے جو سطح پر تو بالکل بے خطر نظر آئے لیکن جس کی تہ میں بڑے بڑے مہیب اژدر اور خوفناک نہنگ چھپے بیٹھے ہوں۔ انہوں نے ۱۹۵۱ء میں، مختلف فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کانفرنس میں یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ پاکستان کا ضابطہ قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب کیا جائے۔ انہوں نے یہ ریزولیوشن یہ جانتے ہوئے پاس کیا کہ ایسا کیا جانا ناممکن ہے۔ بیس برس تک اس ناممکن العمل مطالبہ کا شور مچانے کے بعد اگست ۱۹۷۱ء میں

خود مودودی (مرحوم) نے یہ اعلان کر دیا کہ کتاب و سنت کے مطابق پبلک لاء کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ پھر پاکستان میں قانون سازی کی صورت کیا ہو؟ فرمایا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے ـــــ وہ فقہ جس کے متعلق ان کا اپنا ارشاد تھا کہ اس نے اسلام کو "منجمد شاستر" بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ "منجمد شاستر" زمانے کے ... بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لئے اس فقہ کے قوانین پر عمل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ وہ یہ کہہ کر چلے گئے اور ملک کی کشتی کو ایسے گرداب میں پھنسا گئے جس سے نکلنا اس کے بس میں نظر نہیں آتا۔

جس اسلام کو نافذ کرنے کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا اس کے سامنے تو دنیا کی کوئی ازم بھی ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ لیکن جو اسلام تھیا کریسی یہاں نافذ کر رہی ہے، اس سے ہماری نوجوان نسل دل برداشتہ ہی نہیں، برگشتہ ہو رہی ہے۔ یہ جو آئے دن پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ ہماری نئی نسل اسلام کے بہت قریب آ رہی ہے، یہ ایلہ فریبی نہیں تو خوش فہمی ضرور ہے۔ یہ نسل اسلام سے (یعنی اس اسلام سے جسے تھیا کریسی یہاں رائج کر رہی ہے) متنفر ہی نہیں، سرکش ہو رہی ہے۔ مذہب سے نفرت اور سرکشی، کمیونزم کے لئے راستہ ہموار کر دیتی ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ مروجہ اسلام سے برگشتہ ہو کر کمیونزم کے آغوش میں نہ چلا جائے۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کے لئے یہ پناہ بڑی پرکشش خوش آئند ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ اندیشہ جو ہماری روح میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تھیا کریسی کا آخری ردِعمل لادینی ہوتا ہے۔ خود ہماری تاریخ میں۔ دورِ ملوکیت کی تھیا کریسی نے ہلاکو خان کو آواز دی تھی۔ خدا کرے کہ دورِ حاضر کی ہماری تھیا کریسی روسی آہن کے لئے مقناطیس ثابت نہ ہو جائے۔ حکیم الامت کی نگاہ دُور رس نے شاید اسی خطرہ کو بھانپ کر کہا تھا کہ ؎

از خاکِ سمرقندے ترسم کہ دِگر خیزد
آشوبِ بلاکوئے ہنگامۂ چنگیزے (پیامِ مشرق ص۱۹۲)

خدا کرے کہ ہماری یہ کشتِ آرزو جو اس مردِ درویش کے پاکیزہ آنسوؤں اور اس صاحبِ عزمِ عظیم کی مجاہدانہ گرم جوشیوں سے پروان چڑھی تھی، اس بادِ سموم کی شعلہ باریوں سے محفوظ رہے۔ لیکن قرائن بتا رہے ہیں کہ ہماری یہ دعائیں، تھیا کریسی کی آوردہ اور پروردہ بلاؤں کی حریف شاید ہی ہو سکیں! جب جھکڑ چلتا اور سیلاب امنڈتا ہے تو وہ دیر و حرم میں تمیز نہیں کیا کرتا۔ اسی لئے قرآن نے کہا تھا۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۸/۲۵)

اُس فتنہ سے محتاط رہو جو (جب اٹھتا ہے تو) انہی تک محدود نہیں رہتا جنہوں نے

(اس کا باقی حصہ صفحہ (۱۶) پر ملاحظہ ہو)

حقوق یا فرائض؟

حقوق و فرائض کی بحث بڑی پرانی چلی آ رہی ہے۔ کس کے حقوق؟ کس کے فرائض؟ اس کا تصفیہ نہیں ہو پاتا۔ فرائض کی بات تو بہت کم ہوتی ہے۔ نعرے حقوق کے لئے لگائے جاتے ہیں۔ مرد اپنے حقوق کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں تو عورتیں اپنے حقوق کے لئے فریاد کرتی نظر آتی ہیں۔ والدین اپنے حقوق نہ ملنے پر شکوہ کناں رہتے ہیں تو اولاد اپنے حقوق کی خاطر شعلہ بداماں ہو رہی ہے۔ اسی طرح عزیز و اقارب اپنے حقوق کے لئے جھپٹا جھپٹی کر رہے ہیں تو پڑوسی اپنے حقوق کی حفاظت میں مرنے مارنے پر تلے ہیں۔

غرضیکہ سب طرف سب کو اپنے اپنے حقوق کی فکر کھائے چلی جا رہی ہے۔ فرائض پر کسی کی نظریں نہیں جاتیں۔ فرائض کی بجا آوری کے بغیر حقوق برآری ہو تو کیسے؟ فرائض کی طرف سے آنکھیں بند کرنے کا نتیجہ حقوق سے محروم رہ جانے کے سوا ہو نہیں سکتا۔ حقوق کی جنگ فرائض کے ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہے۔ نعرے بازی سے نہیں۔ کبھی ہم نے اس نکتہ پر غور کیا؟ اگر کرتے تو معاشرے کو حق تلفیوں کے زخموں سے بچا لیتے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق میں تفریق و امتیاز کا بھی چرچا بہت ہوتا ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ انسان بطور انسان حقوق رکھتا ہے اور خالق کائنات نے ہر انسان پر دوسرے انسان کے حقوق لازم ٹھہرائے ہیں۔ اگر ان حقوق کو سمجھ لیا جائے تو انسانی معاشرہ میں نہ کوئی اپنے فرائض سے غافل ہو سکتا ہے نہ کسی کی حق تلفی کر سکتا ہے اور حق تعالیٰ کا عطا کردہ یہ اصول بھی اس کے بندوں کے سامنے رہنا چاہیئے کہ اس (اللہ) کے حقوق کی ادائیگی انسانوں کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ قرآن کریم میں انسانوں کے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے۔ حقوق اللہ کے تعلق سے پیارے قرآن میں سورہ انعام میں ایک مقام پر یہ کہا گیا ہے کہ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ "اور جب فصل کاٹو تو اس میں سے اس (اللہ) کا حق بھی دے دیا کرو" ظاہر ہے کہ یہ بھی درحقیقت محتاجوں کا ہی حق ہے جسے اس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الذّٰریٰت اور سورۃ المعارج میں مومنین کی کمائی میں ہر اس شخص کا حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ بتایا گیا ہے جس کے پاس اپنی ضرورت سے کم ہو یا جو بالکل کما سکنے کے قابل نہ ہو، حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ انسانی حقوق و فرائض پر جب ہم بصیرت کی نگاہ ڈالتے ہیں تو پوری انسانی زندگی فرائض کی بجا آوری اور حقوق کی ادائیگی کی ایک مکمل تصویر نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسا مسلسل عمل ہے جو کسی نہ کسی صورت میں ہر وقت جاری و ساری رہنے کا متقاضی ہے جہاں اس میں تعطل پیدا ہوا، انسان مقامِ انسانیت پر کھڑا نہ رہ سکا۔ نوعِ انسانی کی تمدنی زندگی کا تمام تر انحصار اسی امر پر موقوف ہے کہ معاملاتِ زندگی میں انسان کیونکر ایک دوسرے کے معاون و مددگار بنتے

اور ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہیں۔

قرآن حکیم میں مجموعی طور پر انسانوں کے حقوق کا ذکر مختلف مقامات پر معاشرتی تعلقات کے حوالے سے آیا ہے اور وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ افراد معاشرہ کی مختلف حیثیتوں میں ان کے لئے حقوق و فرائض کی نوعیت کیا ہے۔ کس کس کے فرائض کس کس کے حقوق بنتے ہیں۔

چونکہ معاشرہ کی ابتدا گھر سے ہوتی ہے۔ اس لئے انسانی حقوق و فرائض کا سلسلہ بھی گھروں سے شروع ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے قرآن کریم نے میاں۔ بیوی۔ والدین اولاد۔ بہن بھائی اور عزیزو اقارب کے آپس کے حقوق و فرائض کی ادائیگی کو پہلے درجہ پر رکھا ہے۔ اور جگہ جگہ اس کی تاکید کی ہے اور ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ میاں بیوی کے تعلق سے قرآن کریم نے مرد عورت کے حقوق میں کوئی تخصیص روا نہیں رکھی۔ فرمان ربّی ہے۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ " مردوں کے ذمہ عورتوں کے ویسے ہی حقوق ہیں جیسے عورتوں کے ذمّے مردوں کے حقوق ہوتے ہیں۔ جانے پہچانے طریقہ پر"

اس میں معاشی، معاشرتی، سماجی، اخلاقی تمام قسم کے حقوق شامل ہیں۔ اولاد اور والدین کے درمیان حقوق و فرائض کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اولاد کی صلاحیتوں کو نہایت غور و پرداخت سے پروان چڑھانا ان کی صحیح تعلیم و تربیت کرنا ماں باپ کا فریضہ ہے۔ ان کی جسمانی تربیت بھی اور علمی و اخلاقی تربیت بھی در اصل نسل انسانی کے حقوق کی ابتدا تو اسی دن سے شروع ہو جاتی ہے جب انسانی بچہ اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے اور آغوش مادر میں حفاظت و راحت پاتا ہے۔ ایک ماں جو اپنے بچے کو پالتی ہے چوبیس گھنٹے اس کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی ہے اور بغیر چوں چرا اپنی جان پر سختیاں اور تکلیفیں سہہ کر بچے کے جسم و جان کی پرورش اور نگہداشت کرتی ہے۔ تو در اصل وہ انسانیت کا سب سے بڑا حق ادا کر کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کی بنیاد رکھتی ہے۔ ماں اپنے بچے کو [illegible] قابل بناتی ہے کہ وہ آگے چل کر ان لوگوں کے حقوق ادا کر سکے جن سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔ جب اولاد [illegible] و باشعور ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی اہل ہو جاتی ہے تو اس کے فرائض والدین کے حقوق بن جاتے ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ کتاب مبین قرآن حکیم میں والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم بار بار آیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی ۲۳ ویں آیت میں بتایا گیا ہے کہ پروردگار نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی ہستی کی اطاعت و فرماں پذیری اختیار نہ کرو۔ اور اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو۔ دوسری جگہ اللہ کا فرمان ہے کہ ہم نے تمہیں والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ اس سلسلے کی تمام آیات قرآنی سے اولاد کے والدین کے حسن سلوک کی اہمیت واضح ہے۔ والدین کا یہ وہ حق ہے جس سے روگردانی کرنے کا اولاد حق نہیں رکھتی اور یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ حسن سلوک سے مراد روپیہ پیسہ سے مدد کر دینا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ بڑھاپے کی وجہ سے جتنی کمی والدین میں آتی جا رہی ہو۔ اس کو اولاد اپنی محنت اور توجہ سے پورا کرتی جائے۔ تاکہ ان کی زندگی متوازن ہونے سے نہ رہ جائے۔ اس کا حسن ختم نہ ہو جائے۔ والدین سے عزت و احترام سے پیش آنا۔ ان سے کسی حالت میں بھی درشت کلامی نہ کرنا۔ ان کی خدمت کرنا یہ سب وہ حقوق ہیں جو حسن و سلوک سے متعلق ہیں اور اولاد کی ذمہ داری ہیں۔ اسی طرح بہن بھائیوں اور رشتے داروں کے معاملے میں عدل و انصاف

اور محبت و احسان کو ملحوظ رکھ کر ان کے حقوق پورے پورے ادا کرنے کا ہر فرد معاشرہ کو مکلف ٹھہرایا ہے۔ لیکن حقوق و فرائض کا سلسلہ گھر والوں اور عزیزوں تک ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ ہمارا دین، ہمارا نظام اور ہمارا ضابطۂ حیات قرآن کریم گھروں پر توجہ دلانے کے بعد گھروں کی دیواروں کو پیچھے سرکا کر ہمیں پورے معاشرے میں داخل کرتا ہے اور ہمسایوں سے شروع کر کے معاشرے میں تنہا رہ جانے والوں۔ ضرورت مندوں، مسکینوں۔ مسافروں سب کے حقوق پورے کرنا۔ اللہ پر ایمان رکھنے والوں کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ ان کے حقوق پورے کرنا اور ان کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے قابل بنانا ان لوگوں کے فرائض میں داخل ہے۔ جو مال و دولت اپنی جائز ضروریات سے زیادہ رکھتے ہوں اور عقل جہاں بیں سے کام لیتے ہوں۔

یتیموں اور سائلوں کے متعلق قرآن کریم کی ہدایت یہ ہے کہ معاشرے میں بے یار و مددگار اور تنہا رہ جانے والوں کو دباؤ اور دھتکارو نہیں اور نہ ہی کسی ضرورت مند سائل کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرو۔ سائل کے متعلق سورۂ بقرہ میں بتایا گیا ہے کہ وہ تو اپنے چہروں سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ منہ سے کچھ مانگتے نہیں۔ وہ لپٹ لپٹ کر مانگنے والے گداگر نہیں ہوتے۔ ایسے پیشہ ور بھیک منگے قرآن پاک کے بتائے ہوئے سائلوں کی شق میں نہیں آتے۔ سائل سے مراد مجبور ضرورت مند ہیں۔ جنہیں خیرات کے طور پر نہیں دیا جاتا بلکہ یہ ان کا حق ہوتا ہے۔ سوچنے کا مقام یہ ہے کہ ہم داعیانِ دین اسلام نے کیا اپنی عملی دنیا میں وہ قرآنی روش اختیار کر رکھی ہے جس میں مال و دولت کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دینا لازم ہوتا ہے۔ جو معاشرہ میں لاوارث اور بے بس رہ جانے والے لوگوں کے لئے اپنی دولت وقف کر دینے کی تاکید کرتی ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جاتا ہے۔ یا ان میں کام کاج کرنے کی استعداد باقی نہیں رہتی۔ یا جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ جب انسان یہ فرائض پورے کرتے ہیں تو حقوق خود بخود پورے ہو جاتے ہیں اور اللہ کے بندوں کے حقوق کا خیال رکھنے والے اللہ کے بندوں کی کیفیت تو یہ ہوتی ہے۔ کہ يُؤْثِرُونَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ یعنی وہ ہمیشہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ انہیں خود تنگی سے ہی گزارا کیوں نہ کرنا پڑے۔"

یہ قرآن کا عطا کردہ وہ اصل الاصول ہے جو انسان کو مقامِ مومن عطا کرتا ہے اور جس سے انسانیت کی نشوونما بلا روک ٹوک ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر کیا ہمارے ہاں ایسا ہو رہا ہے؟ کیا ہم خود بھوکے رہ کر کسی بھوکے کا پیٹ بھرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟ یہ سوال ہم سے جواب چاہتا ہے۔ اگر ہم سچ بول سکیں تو اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ فرائض سے لاتعلق رہ کر حقوق پہ شب خون مارتے رہنا ہمارا مقصودِ حیات بن چکا ہے۔ پھر معاشرہ نفسا نفسی کا شکار کیوں نہ ہو!! بلاشک و شبہ خدا کی اس سرزمین میں فتنہ و فساد اور ظلم و انتشار اسی وقت پھیلتا ہے جب مرد و زن کے ایک طبقہ کے سر پہ مفادِ خویش کا بھوت سوار ہو جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر جتن کرتا ہے اور اسے اس کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کے اس طرز عمل سے کتنے زیر دست مزید پستے چلے جاتے ہیں۔ خود غرضی اور مفاد پرستی کا یہ انسانیت سوز رویہ دوسرے انسانوں سے ان کے حقوق چھین لیتا ہے۔ اپنے معاشرے میں ہم یہ سب کچھ ہوتا دیکھتے ہیں۔ مگر اس طرح دیکھتے ہیں

(اس کا باقی حصہ صفحہ (۱۰) پر ملاحظہ ہو)